عصمت چغتائی کے بہترین افسانے

عصمت چغتائی

چودھری اکیڈیمی۔ لاہور

چوہدری اکیڈمی
۳۰۵ ۔ ذوالقرنین چیمبرز ۔ گنپت روڈ ۔ لاہور

ناشر ——— محمد خالد چودھری
اہتمام ——— میاں محمد اسلم
حسن کار ——— حفیظ سرور
مطبع ——— وفاق پریس لاہور
تعداد ——— ایک ہزار
اشاعت ——— اپریل ۱۹۷۹ء
کتابت ——— ک ۔ ع ۔ م
قیمت ——— روپے

چوہدری اکیڈمی ۔ لاہور

ترتیب

عرضِ حال

اُردو ادب کی اشاعت کا سوال جب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم بالعموم اپنی تمامتر توجہ صرف مصنفین پر مرتکز کر دیتے ہیں اور ناشرین کو قطعی طور پر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ طریقِ فکر کچھ مناسب نہیں ہے۔ اُردو ادب کی ترقی و فروغ میں مصنفین کے ساتھ ساتھ ناشرین نے بھی جو حصّہ لیا ہے اس سے صرف نظر کرنا صریحاً ناانصافی ہے۔

میرے اباجی مرحوم چوہدری برکت علی اُردو ادب کے اُن ناشرین میں سے ہیں جن کے نام اردو ادب کی تاریخ میں زندہ رہیں گے۔ چوہدری صاحب نے اُردو ادب کے لیے اپنی ساری کوششیں وقف کر دی تھیں۔ مکتبہ اُردو سے بیشتر اُن کا ذاتی ادارہ پنجاب بک ڈپو صرف درسی کتابیں شائع کرتا تھا اور اُن کی ساری تگ و دو انہی کتابوں تک محدود تھی۔ مگر ایک نوجوان کے حوصلے بڑے بلند تھے۔ دوسرے انہوں نے محسوس کیا کہ برصغیر میں ایسے بہت ہی کم ادارے ہیں۔ جو ادبی کتابوں کی اشاعت کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ اس چیز کو مدِنظر رکھ کر انہوں نے موجودہ صدی کی چوتھی دہائی کے آخر میں ایک ایسے ادارے کی بنیاد رکھی جو اپنی روزافزوں طباعتی سرگرمیوں کی وجہ سے اُردو کا عظیم الشان ادارہ بن گیا اور جس کی اعلےٰ درجہ کی مطبوعات نہ صرف ملک کے اندر بلکہ ملک سے باہر بھی پھیل گئیں۔

مکتبہ اُردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے پاک و ہند میں پہلی مرتبہ اُردو کے پرانے

اور نئے اہلِ قلم کی تصنیفات اور تالیفات کی طرف پوری سنجیدگی سے توجہ کی اور بہت اچھی کتابیں بہت ہی کم مدت میں شائع کر دیں۔

چوہدری اکیڈیمی میرے محترم اور پیارے ابا جی ہی کی ایک نئی شکل ہے اور میری دلی آرزو ہے کہ میں بھی اپنے ابا جی کی طرح بلند پایہ کتابیں شائع کروں اور ادب کی ثروت میں اضافہ کروں۔

مجھے توقع ہے۔ توقع نہیں یقین ہے کہ ابا جی کے احباب اور اُردو ادب کے قارئین میرے ساتھ مخلصانہ تعاون کریں گے تاکہ میں اپنی کوششوں میں کامیاب ہو سکوں۔ آج میں اپنے ادارے کے زیرِ اہتمام برصغیر کی نامور اور ممتاز افسانہ نگار محترمہ عصمت چغتائی کے منتخب افسانے شائع کر رہا ہوں۔ میرے ابا جی نے عصمت کا پہلا ناول "ٹیڑھی لکیر" شائع کیا تھا جس کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی تھی اور آج بھی یہ اُردو کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

عصمت چغتائی کی اصل شہرت اُن کے افسانوں کی وجہ سے ہے۔ ان افسانوں میں اُن کی پوری شخصیت جذب ہو گئی ہے۔ عصمت پہلی خاتون ہیں جنہوں نے ان رازوں کو منکشف کیا ہے جو ہماری سوسائٹی کے متوسط مسلم گھرانوں کی لڑکیوں میں چھپے ہوئے تھے اور جن کا انکشاف نہایت جرأت مندانہ اقدام تھا۔

آپ ان افسانوں میں وہ بات پائیں گے جو اُردو کے کسی دوسرے افسانہ نگار کے ہاں نہیں ہیں۔

عصمت چغتائی کے منتخب افسانے اُردو ادب میں ایک مستقل اضافہ ہے۔

محمد خالد چوہدری

دیباچہ

اُردو افسانہ میں عصمت کا اپنا ایک مقام ہے۔ منفرد اور اچھوتا۔ بلند اور نازک وہ ایسے ایسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے جو اگرچہ ہماری روزمرہ زندگی کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن بادی النظر میں محسوس نہیں ہوتے۔ عصمت انہی سے اپنا مواد حاصل کرتی ہے اور پھر دھنک کے رنگوں کی طرح قرطاس پر بکھیر دیتی ہے اس کے ہر افسانے کا انجام ایک غیر متوقع منظر پر ہوتا ہے۔ ایک ایسا جملہ ہوتا ہے۔ جو احساس کی گہرائیوں میں کرچیوں کی طرح چبھنے لگتا ہے۔ سعادت حسن منٹو۔ کرشن چندر کو بڑا افسانہ نگار کہا جاتا ہے لیکن اگر کوئی انصاف کی رو سے دیکھیے تو موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے عصمت ان سے کہیں آگے بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔

ترقی پذیر ادب کے بارے میں عصمت کی رائے ہے کہ یہ ایسا ادب ہے۔ جو انسان کی بھلائی چاہے۔ انسان کی ترقی چاہے۔ وہ ادب وہ آرٹ جو انسان کو پیچھے نہ دھکیلے اس کی دنیا کو اچھی سمت چلائے۔ وہ انسان کو گندگی سے نکال کر صاف و شفاف مقام پہ پہنچا دے۔ اندھیرے میں جانے کی بجائے اجالے کی طرف آئے وہ وہ ادب ترقی پسند ہے۔ عصمت کے نزدیک ترقی پسند ادب تو بہت پہلے سے لکھا جا رہا ہے۔

کبیر کو وہ ترقی پسند شاعر مانتی ہیں۔ اقبال کو ترقی پسند سمجھتی ہیں۔ غالب تو ترقی پسند

کہتی ہیں۔

عصمت کے نزدیک ادب کا تعلق معاشرے سے ہے اور معاشرہ اس وقت ترقی نہیں کر سکتا۔ ادب لوگوں کو سوچنے میں صحیح طریقہ سے صحیح راہ پر نہ پہنچائے۔ آج کے دور میں محسوس ہوتا ہے کہ ادب انسان سے قریب تر ہو رہا ہے مگر شاید اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ادب فطرت اور قدرت سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ نئی دریافتوں اور ایجادوں، نئے نظریات و خیالات نے بتادیا کہ انسان قدرت کا محتاج نہیں، بلکہ وہ قدرت پر قابو پا رہا ہے۔ ادیب کے لکھنے کا مقصد یہی ہے کہ اس کی تحریر عوام الناس کے قریب تر ہو جائے جس میں اصلاحی پہلو بھی شامل ہو۔

عطش درانی

تل

"چودھری۔ اے چودھری۔ سنو۔"

گنیش چند چودھری چپ تھا۔

"شش۔"

"... کیا بھینگر کی طرح سنی سنی کرے جا رہی ہو۔"

"بمبئی میں تھک گئی جو۔"

"چپکی بیٹھی رہ۔"

"مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا۔ واہ ساری پیٹھ تختہ ہو گئی۔ ہائے رام۔"

"ہنک۔ ہنک۔"

"چچ چچ۔"

"مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

چودھری چپ۔

"یہاں نیچے کولھوں میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں۔"

"دیکھ رانی دس منٹ بھی نہیں ہوئے اور تو تھک گئی۔"

"اور کیا۔ کوئی میں مٹی کی بنی ہوں، واہ۔" رانی نے اپنے موٹے ہونٹ پھیلائے اور سنگ مرمر کی چوکی سے نیچے پھسل گئی۔

"چڑیل۔ کہتا ہوں سیدھی بیٹھ۔ حرامزادی۔" چودھری نے رنگوں کی تھالی اسٹول پر پٹخی اور رانی کے کندھے پکڑ کر دو چار جھٹکے دیئے۔

"تو۔ تو۔ تو پھر لو۔" وہ زمین پر لمبی لیٹ گئی۔ چودھری جل کر کوئلہ ہو گیا۔ اس کا جی چاہا رانی کے چکنے چکنے سیاہ گالوں پر کھڑی کھڑی تھپیاں مارے مگر وہ جانتا تھا پھر تو وہ بالکل ہی قابو سے باہر ہو جائے گی اور بہانہ کر کے رونے لگے گی۔ اور پھر وہ تصویر جس کے لیے وہ اتنی جان ماری کر رہا تھا نامکمل رہ جائے گی۔

"دیکھ تھوڑی دیر اور بیٹھی رہ۔ اور پھر۔" چودھری نرم سے بولا۔

"تھک گئی نا۔" وہ لوٹ کر چت ہو گئی۔

"تھک گئی! اور جو سڑک پر دن بھر گوبر بینتی تھی تو نہیں تھکتی تھی۔"

"کتیا کہیں کی۔" چودھری کو پھر غصہ چڑھا۔

"کو بینتا تھا گوبر۔ تم بینتے ہو گے۔ واہ کیسے ساس نندوں کے سے طعنے دیتے ہو۔" وہ روٹھ کر بیٹھ گئی اور چودھری کو یقین ہو گیا کہ آج کا دن تو گیا ہاتھ سے۔

"اچھا دیکھ گھڑی رکھی ہے یہ۔ بس آدھا گھنٹہ، سمجھی۔"

"آدھ گھنٹہ نہیں۔ بس چھ منٹ۔" وہ چوکی پر چڑھتی ہوئی بولی۔ بات یہ تھی کہ چھ سات سے زیادہ تو اسے گنتی بھی نہ آتی تھی اور چودھری خوب جانتا تھا کہ چھ منٹ کے بجائے وہ اسے آدھا گھنٹہ جمائے رکھے گا۔ رانی نے کمر کو کھینچ کر لمبا کیا اور بھاری پھولدار مٹکی

کندھے پر رکھی اور بیٹھ گئی مگر کتنی دیر کے لیے۔

"ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں۔" چودھری جلدی سے جھک گیا۔

"دیکھو تو۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔"

"دیکھو تو۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔"

تھوڑی دیر خاموشی سے برش چلتے رہے، رنگ پر رنگ دوڑتے رہے مگر کوئی ڈیڑھ منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ رانی نے لمبی لمبی سانس لی۔

"ہا۔ بس چودھری۔ ہو گئے چھ منٹ۔"

"ہوں ہنک۔" وہ جلدی جلدی کبھی اسے اور کبھی ادھ بنی دھبّوں والی تصویر کو دیکھنے لگا۔

"سردی لگ رہی ہے چدّر سا اوڑھ لوں؟"

"نہیں۔"

"آ۔ آ۔ ئے۔ جاڑا۔" وہ کتّوں کی طرح رونے لگی۔ چودھری چپ،

"کمر۔ کمر۔ میری کمر رے۔ چودھری جی۔!" اصل میں وہ آج شرارت پر تلی ہوئی تھی۔

"چدّر۔ چدّر۔ میری چدّر۔"

چودھری چپ۔

"ہوں، کہہ رہی ہوں میں تھک گئی۔ اب یہ ہنڈیا پٹختی ہوں۔ ہاں نہیں تو۔" چودھری

جلدی سے مڑا۔ وہ یہ تصویر پکا کرنے کے لیے، ہنڈیا عجائب خانے سے مانگ کر لایا تھا۔ اگر رانی توڑ دے تو بس سمجھو کہ رانی کی کھوپڑی کی خیر نہیں۔

"تو پھر تھک جو گئی۔ جوڑ کاٹ رہی ہے چودھری۔" وہ اپنے گھنے بالوں کو الجھانے لگی۔ اور پھولدار مٹکی نیچے ٹکا دی چودھری نے پیر دور رکھ لیے آنکھیں گھما کر لٹو کی طرح باہر نکال لیں۔ اور غصے سے اس کے چہرے کا گوشت پھڑکنے لگا۔ اس کی چھنکاہری چھدری داڑھی کشتی کے بادبان کی طرح لہرانے لگی۔ جیسے بڑا بھاری طوفان آنے پر سفید سفید بادبان ہلنے ہیں اور اس کی گنجی چکنی کھوپڑی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئیں۔

"لیٹے لیٹے کمر تو دکھ گئی۔" رانی نے ڈر کر جلدی سے اپنی نشست ٹھیک کر لی اور پھر وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اوہو۔ ہو۔ ہوبرر۔" وہ ہونٹ بجا کر ڈکرائی۔ "د۔ ددو۔ کوئی مر بھی جائے تو بھی۔ رو۔ رو۔ بررر۔"

چودھر نے آنکھیں پھاڑ کر اسے گھورا۔ جب کبھی وہ رونے لگتی تو چودھری کے رخساروں کی مچھلیاں پھڑکنے لگتیں اور ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہونے لگتا اور برش ہاتھوں میں پھلجھڑی کی طرح ناچنے لگتے۔ طشتری کے سارے رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر ایک خلا میں تبدیل ہو جاتے اور اسے کچھ نہ سوجھتا اور یہ کرب کی حالت اس پر اس وقت تک طاری رہتی، جب تک اسکے دماغ سے چبھتا ہوا کانٹا نہ نکل جاتا اور رانی کی حرکتیں اس وقت کانٹا نہیں بھالا بن کر اس کی ہستی کے آر پار نکلی جا رہی تھی۔

ہر ذی روح پر چودھری کے اس دورے کا پورا پورا اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ رانی بھی نہ بچ سکی۔ اس نے پھر اپنے پیٹ کو پچکایا اور ہونٹوں سے پھر کئی سی آوازیں نکالنی

ہوئی سیدھی بیٹھی۔

تھوڑی دیر تک دنیا پھر اپنے محور پر گھومتی رہی۔ چودھری کا برش سپاٹے بھرتا رہا۔ رنگ کی تھالی گندی اور بد شکل ہوتی گئی۔ لیکن۔

"چودھری" اس دفعہ رانی پیار سے بولی۔ چودھری کی بغل میں جیسے چوہا سا کودا۔ دنیا کے ایک محور کا پایہ ذرا سا لچکا۔ جانے بھائی محوروں میں پائے لگے ہوتے ہیں کہ نہیں۔ لیکن ہوا کچھ نہ کچھ ضرور!

"چودھری تم نے یہ دیکھا ہے؟"

چودھری کے کندھے جھرجھرائے اور چکنی ڈلی کی شکل کی کھوپڑی میں پسینے کے دانے پھوٹ نکلے۔ وہ پھر بولی۔

"دیکھو۔ یہ کالا تل۔ یہ دیکھو گردن سے ذرا نیچے۔ اور پیچھے ذرا الٹی طرف۔" ایک ہاتھ سے مٹی پکڑ کر اور ہونٹ لٹکا کر وہ اپنی گردن سے جھانکنے لگی۔

"دیکھا ہے یہ تل۔ اور تم تو دیکھ رہے ہو چودھری۔" وہ ہنس کر شرمانے لگی۔ "دلو مجھے تو شرم آتی ہے!"

"سیدھی بیٹھ۔" چودھری غرایا۔

"اوں۔ بڑے آئے۔ بھلا کوئی کسی کا تل بھی دیکھتا ہوگا۔ اور جب وہ ایسی بری جگہ ہو۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔" وہ اترائی۔

"میں نے تل وِل کچھ نہیں دیکھا اور نہ دیکھوں۔" بدمزاجی بڑھی۔

"ہوں۔ جھوٹے۔ سراسر کانڑی آنکھ کر کے دیکھ رہے ہیں۔ اور ہی ہی۔" وہ آوارہ عورتوں کی طرح اٹھلائی۔

"رانی۔"

رانی نے صرف ناک اچکا دی۔ چودھری مغلوب ہو کر کاٹھ کے ڈبے پر بیٹھ گیا۔

"تجھے معلوم ہے کہ میں کتنا بڑا ہوں۔"

"ہائے رام۔کوئی۔کتنے بڑے؟" وہ بھی مٹکی جھکا کر آگے بڑھی۔

"میں تیرے باپ بلکہ دادا کے برابر ہوں۔ اور تو۔ تو بتا کتنی ہوگی؟ پندرہ برس سے آگے نہیں۔ اور تجھے یہ معاشی کی باتیں کس نے سکھائیں؟"

چودھری دادا برابر تو کیا اس کے باپ برابر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ذرا معاملے کو دبانے کے لیے کہہ دیا تھا اس نے۔

"اوں۔ بدمعاشی کی باتیں تو تم کرتے ہو کہ تل دیکھتے ہو۔ ایسی بری جگہ تو تل ہے۔" وہ آہستہ آہستہ تل ٹٹولنے لگی۔

"ذرا سی کا ہے کو ہوں واہ۔ ذرا سی کہتے رہتے ہو۔ ذرا سی ہوتی تو۔"

"تو۔تو؟۔تو کیا؟"

"رتنا کہتا ہے جس کی چھاتی پر تل ہوتا ہے وہ۔وہ۔"

"رتنا؟ یہ رتنا کو کیسے معلوم کہ تیرے کہاں کہاں تل ہے۔"

"میں نے دکھایا تھا۔" وہ تل کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔

"تو نے۔تو۔تو۔تو نے رتنا کو دکھایا تھا تل؟"

چودھری کا پھر خون کلبلایا اور بغلوں میں چوہے پھدکے اور گالوں کا گوشت پھر برش پھلجھڑی کی طرح تھرکنے لگا اور رنگ بدلنے شروع ہوئے۔

"آ۔تو۔واہ۔اس نے دیکھ لیا تو میں کیا کرتی۔"

"کیسے۔کیسے دیکھ لیا۔تل اس نے جبکہ تو۔" چودھری کی بتیسی ڈھیلے کواڑوں کی طرح بجنے لگی۔

"نہارہی تھی میں تو اس نے۔" اس نے مٹکی سنبھالی اور نشست پر سجنے لگی۔

"ہاں تلیا پہ نہا رہی تھی۔ مجھے اکیلے ڈر لگا کہ کوئی آ نہ جائے۔ اس لیے میں اسے سنگ لے گئی تھی۔ کوئی آ جاتا تو۔ میں نہا رہی تھی۔ شلو کا بھی دھویا تھا۔ مجھے ڈر لگا کہ کوئی آ نہ جائے اس لیے اسے لے گئی۔ ہاں۔" اس نے بھولپن سے فیصلہ کیا۔

"رانی" وہ آگے بڑھا۔

"آں۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا ادھر منہ رکھیو۔ مگر" — "مگر؟"

"مگر وہ دور بیٹھا رہا۔ پھر نے کہا کہا" رتنا میرے تل ہے۔ بڑی بری جگہ۔ وہ بولا نہیں۔ تو میں نے بولا نہیں دیکھتا تو مت دیکھے ہاں بھئی مجھے کیا۔ کیوں چودھری۔"

"پھر تو کیسے کہتی ہے اس نے تل دیکھا؟

"ہاں پھر میں ڈوبنے جو لگی۔ پانی اتا اتا گہرا تھا" وہ تل سے ذرا نیچے انگلیاں رکھ کر بولی۔

"قطامہ!" چودھری برش پھینک کر لکڑی کی طرف چلا۔

"ہائے رام۔ پھر۔ پھر سنو تو۔ چودھری۔ تو کیا میں ڈوب جاتی؟"

"تجھے تیرنا نہیں آتا کتیا! رات دن ہودی میں جو ڈبکیاں لگاتی تھی تب نہ ڈوب مری!"

"واہ۔ واہ میں کیوں ڈوبتی۔ میں۔ میں۔ تو تل دکھا رہی تھی!"

"تو نے تل دکھانے کے لیے بہانہ کیا تھا۔" چودھری نے پتلی سی قمچی ہوا میں نچائی۔ وہ اب مسکرا رہا تھا۔

"ہائے رام مجھے دھوتی تو اوڑھ لینے دو۔ چودھری جی۔" وہ بندریا کی طرح اچک کر کھاٹ پر جا کھڑی ہوئی۔

"جو تم مارو گے تو سڑک پر بھاگ جاؤں گی چودھری، مجھے شرم آئے گی۔ میں کہہ دوں گی چودھری۔ چودھری۔"

بڈھا رک گیا۔ "کیا کہہ دے گی؟"

"میں کہہ دوں گی، چودھری کہتا ہے مرا تل اُم اُم ۔"

"پلتی!" چودھری پاگل گیدڑ کی طرح ناچنے لگا۔ رانی سمجھ گئی کہ تیر نشانے پہ بیٹھا۔ سب سے کہہ دوں گی سُنا چودھری! مارو تم مجھے۔ مار کے بھی دیکھ لو۔ واہ ایسے کیوں گھور رہے ہو۔ اتنی تو چھوٹی ہوں میں ذرا سی چھوکری بڑے خراب ہو تم جی۔" وہ ہلکے ہلکے دروازے کی طرف بڑھنے لگی اور چودھری سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک دفعہ تو جی میں آیا اُٹھ کر تصویریں تو لگا دے آگ اور رانی کو اتنا کوٹے اتنا کوٹے کہ کچومر بنا دے۔ مگر پھر اسے نمائش یاد آگئی جس میں اُسے پانچ ہزار روپے کا انعام ملنے والا تھا۔ ایک تو اس کا سر ویسے ہی گھوم رہا تھا۔ وہ تصویریں تو بنانے لگا تھا اور ہزاروں تصویریں بنا کر چھوڑ دی تھیں۔ اس نے کھلتے ہوئے گلاب کا شرمایا ہوا رنگ، ٹھٹھے مارتا ہوا سبزہ، ناچتا تھرکتا آبشار بھی بنایا تھا۔ اس نے سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر رکھا تھا۔ دُور دُور کے ملکوں کی ننگی اور آراستہ و پیراستہ عورتیں بھی اس کے سامنے گھٹنوں بیٹھنے کا فخر حاصل کر چکی تھیں مگر یہ چلبلی گنوار چھوکری جسے اس نے موری کی غلاظت سے اُٹھا کر اپنے شاہکار کے لیے چنا تھا۔ اس کے قابو میں نہ آئی۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ ہزاروں رنگ لیتھڑنے پر بھی وہ اس کے جسم جیسا مسالہ تیار نہ کر سکا۔ اس نے سیاہی میں صندل گھول کر اس میں نیلا رنگ ملا دیا، پھر بھی اس کے رنگ کی چمک آبنوسی صندلی، نیلی اور کچھ بادامی لہر لیے ہوئے تھی۔ ایک مصیبت ہوئی تو خیر۔ آج اس کا رنگ سرمئی ہو نا تو دوسرے

دن اس میں سے شفق کی سرخی پھوٹنے لگتی اور پھر کبھی اچانک اس کا جسم ختم ہوتی ہوئی رات کی طرح اودی اودی گھٹاؤں سے ملنے لگتا اور کبھی نہ جانے کہاں سے اس میں سانپ کے زہر کی سی نیلاہٹ جھلکنے لگتی اور آنکھیں بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتیں اس نے پہلے دن نہایت اطمینان سے کولتار کا سا سیاہ رنگ تیار کیا لیکن پھر اسے پتلی کے گرد لال لال ڈورے نظر آئے اور پھر ان ڈوروں کے آس پاس کی زمین بادلوں کی طرح نیلی معلوم ہونے لگی۔ وہ جھنجھلا گیا اور ڈھیر سارا رنگ بیکار گیا لیکن اس کے غصے کی جب تو انتہا ہی نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ذرا سی دیر میں کولتار جیسی پتلیاں سبز ہونے لگیں اور ہوتے ہوتے دو زمرد کی ڈبیوں کی طرح ناچنے لگیں۔ پتلیوں کے آس پاس کا میدان دودھیا سفید ہو گیا اور ڈورے قرمزی ہو گئے۔

اُف وہ سر پکڑ کر جھومنے لگا اور اوپر سے یہ باتیں:

"مچھر کاٹ گیا!" وہ بچوں کی طرح منمنائی۔

آج چودھری نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ گھنی سادھ جائے گا اور بولے گا ہی نہیں۔

"اتنے مجھے کاٹتے ہیں کہ کیا بتاؤں۔ یہ مچھر"

چودھری چپ۔

"ہائے رے، کیسے کاٹتے ہیں یہ مچھر!" اس نے موٹی طلسمی الیسی بازلری گالی بکی جو کچھ عام بھی نہیں تھی۔ چودھری اچھل پڑا۔ گالی! یعنی یہ لڑکی ہو کر اتنی موٹی گالی جانتی ہے۔ وہ خود سوائے چند بالکل زبان زد گالیوں کے

ایک بھی گہری قسم کی گالی نہ جانتا تھا۔ اُس نے کبھی گالیوں کے مسئلے پر غور ہی نہیں کیا یہ گالی تو شاید داروغہ جی کو بھی نہیں آتی ہوگی وہ بھی چند الفاظ استعارے کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں محض ضرورتاً۔

"یہ تو نے گالیاں کہاں سے سیکھیں" وہ مڑ گیا

"کونسی۔ یہ" اس نے بھولپن سے گالی دہرائی۔

"رانی"! وہ جھجکا۔

"چنتن نے دی تھی ایک دفعہ مچھردں کو۔ اس کی کھولی میں بہت مچھر ہیں" وہ بات ٹالنے لگی۔

"اس کی کھولی تو اس کی کھولی میں بھی گئی تھی"!

"ہاں وہ لے گیا تھا کہ چل گڑ دھانی کھائے گی"۔

"پھر گڑ دھانی کھائی تو نے ؟"

"کہاں گڑ دھانی تھی بھی نہیں۔ جھوٹ بول رہا تھا مگر اب لا دینا ہے"۔

"تجھے چنتن گڑ دھانی لا دینا ہے"۔

"ہاں اور کھیلیں بھی"۔ وہ مٹکی پر نقش و نگار ٹٹولنے لگی۔

"اور کھیلیں!" چودھری جانتا تھا کہ وہ بیکار حیرت زدہ ہو رہا ہے۔ رانی گڑ دھانی پر فریفتہ تھی۔ وہ چنتن کی کھولی چھوڑ موری میں کتوں کے جبڑوں سے گڑ دھانی نکال کر کھا سکتی تھی۔

"میں نے تجھے پیسے دیئے پھر بھی تو چنتن سے گڑ دھانی لیتی ہے"۔

"اور میں کب لیتی ہوں میں کوئی منگتی ہوں، وہی دیتا ہے کہتا ہے

پھیل کھولی ہیں مجھے تو وہ آپ بڑا لگتا ہے۔ ایسی بڑی بڑی مونچھیں ہیں مجھے تو چپ چپکیں آنے لگتی ہیں۔ خوں، خوں" وہ ناک سکیڑ کر پھڑ پھڑانے لگی جیسی کسی نے اس کے ناک میں بتی کر دی ہو۔

"ذرا بیٹھ کبھی لوں چودھری" پھر چودھری پر وہ دورانی کیفیتیں چھانے لگیں بھیجے میں تالیاں سی بجنے لگیں اور گال اوپر نیچے کودنے لگے۔ پانچ ہزار روپے کھنن کھنن اس سے دور ننھے ننھے تاروں کی طرح ناچ کر بھاگنے لگے بھورا، کالا سرمئی اور پیلا سب رنگ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے لگے۔ اور کھوپڑی پر آبلے سے اُبھر آئے۔۔۔

اب سوال یہ تھا کہ تصویر بنائے یا پاگل ہو جائے۔ اگر یہی چال رہی تو وہ دن دور نہیں تھا جب وہ سچ مچ کپڑے پھاڑ کر سڑک پر باولے کتے کی طرح لوٹ لوٹ کر اپنا سوکھا مارا جسم چھیل ڈالے اور اپنے دہکتے ہوئے سر کو تلیا کے پانی میں ڈبو دے۔ یوں ہی اس کے قدم تلیا کی طرف اُٹھ گئے تلیا دور نہ تھی۔ عموماً وہ وہاں گھنٹوں ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کو سطح ب پر تھرکتے ناچتے دیکھنے چلا جایا کرتا تھا اور وہ شاعر تھا پیدائشی شاعر ہ دنیا میں تو رہتا تھا مگر دنیا سے کتنا دور۔ بڈھا تو وہ نہ تھا مگر جوان بھی سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا اس نے داڑھی لاپرواہی کی وجہ سے چھوڑ رکھی تھی ر وہ کچھ یوں ہی سی چتکبری ہو چلی تھی: اوہ' پھر اس کی بغلوں میں کوئی : پھڑ پھڑائی۔ رانی کی آواز ایک بھرائی ہوئی مینڈک آواز کے ساتھ ئی۔ مینڈک ہی ہو گا اور کیا برسات۔ خیر برسات تو دور تھی۔ مگر

نہیں مینڈک نہیں بلی ّ خرخرانی ہوگی۔ بلی تو کیا ہاں کچھ ہوگا۔ ضرور لیکن جب اس کی پارسا آنکھوں نے رانی کو رتنا کے ساتھ پانی میں چہلیں کرتے دیکھا تو تھوڑی دیر کے لیے وہ اسے بھی اپنے تخیل کا فریب سمجھا۔ تخیل اسے چھیڑنے کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشا کرتا تھا۔ آج تو حد ہی کردی تھی۔

لیکن جب وہ آگے بڑھا تو ہنسی کے زمزمے رک گئے اور وہ حیرت زدہ سنگ موسیٰ کے سے مجسمے آنکھیں پھاڑنے لگے۔ کس قدر صاف تھا واہمہ بالکل بال بال صاف، رتنا کے پٹھوں کا ابھار۔ پانی سے بھیگی ہوئی اس کی لمبی چوٹی۔ قریب قریب بیٹھی ہوئی دو آنکھیں اور رانی کی الجھی ہوئی چوٹی۔ وہ سرمئی، عنابی، صندلی، کافوری اور نیلے رنگ کی آمیزش سے بنا ہوا جسم اور تل! وہ تل ابھرا ہوا۔ گولی کی طرح چودھری کے سینے میں کھٹ سے لگا۔ ایک طرف کو سرکتا بچتا رتنا تو نکل بھاگا، دھوتی اٹھا کر اور رانی دلیری سے کھڑی چھپ چھپ کرتی رہی۔ چودھری کو معلوم ہوا کہ کوئی اسے جھولے میں ڈال کر لمبی لمبی پینگیں دے رہا ہے۔

"تل دیکھ رہے ہو میرا"۔ بڑے بڑے ہو جی۔ وہ منانے کے لیے اٹھلانے لگی۔ چودھری شکر ہے کہ کھڈ کے کنارے آکر سنبھلا۔

"باہر نکل" اس نے اس نئے چودھری کو ڈھکیلتے ہوئے کہا جو دھیمے دھیمے ڈوبتا جا رہا تھا۔

"اوں۔ تم مارو گے"۔ وہ پانی سے اوپر ابھر آئی۔

"آج تجھے ادھیڑ کر نہ ڈال دوں تو میرا نام چودھری نہیں۔"
چودھری نے خود کو یقین دلایا کہ یہ وہی تو چھوکری تھی جو کیچڑ میں مینڈک کی طرح چل رہی تھی۔
"عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آئے گی ــــــــــ"
چودھری سلگ گیا۔
"ننگی عورتوں کو پیٹتے ہو۔ واہ!" وہ اور اوپر ابھری۔
"شرم نہیں آتی۔" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور پانی اس کے ٹخنوں تک آرہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی اس لیے ذرا اکڑ کر باتیں کر رہی تھی۔
"ادں۔ ــــــ جاؤ" وہ شرمانے لگی۔ چودھری کے ہاتھ سے قمچی گر گئی اور اس کا قد کئی انچ لمبا ہو گیا۔ اس کے بازو پھول گئے اور نیچے میں سرسریاں سی رینگنے لگیں۔ بھوبل کے انبار کو ٹھنڈی ٹھنڈی سیاہ آندھی بہالے گئی اور چنگاری بھڑکی۔ دھڑ دھڑ شعلے لپکنے لگے۔ اس کی آنکھیں بھوکی چیلوں کی طرح سیاہ ابھرے ہوئے تل پر جھپٹیں اور۔ اوہ گھن سے جیسے وہ تل ایک سیاہ چٹان بن کر اس کے ماتھے سے ٹکرایا۔ ایک دم وہ لوٹ پڑا اور پٹے ہوئے کتے کی طرح بھاگا۔ کدھر۔ اپنے کمرے میں پلنگ کی طرف۔ اسی دن اس نے رتنا کو نکال دیا۔ وہ بہتیرا کہتا رہا کہ وہ لنگوٹ پہنے تھا مگر چودھری پر تو بھتنا سوار تھا۔ وہ ساری رات خیالات کی فوج کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ کوئی

چیز برمے کی طرح اس کے جسم میں سوراخ کر رہی تھی۔ مگر سوراخ ہو ہی نہیں چلتا تھا۔ جیسے کوئی چٹان راستے میں آگئی ہو۔ آج اسے اپنی تصویروں میں لگانے کے لیے رنگ مل رہے تھے۔ کنپٹی میں ذرا سی نیلا ہٹ ملا دینے سے بالکل وہی۔ وہی بھیگا ہوا سمندر کی تہہ جیسا گہرا اور جیتا جیتا رنگ بن گیا اور آنکھوں کے لیے بھی بس سیاہی میں ہلکی سبزی۔ نہیں اُداہٹ یا شاید سرمئی رنگ اور پھر گلابی گوٹ۔ جہاں آنکھیں ختم ہوتی ہیں نا۔

اس نے چاہا آئینے میں اپنی آنکھیں دیکھے۔ لیکن آئینہ تو جانے اس نے کب سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک مصوّر کو آئینہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہاں آئینے میں دیکھنے کے لیے ہوتا ہی کیا ہے؟ اس کا آئینہ تو وہ ساری تصویریں تھیں جن میں چہرہ تو چہرہ اس کی روح کا کونا کونا نظر آتا۔ اس کا دل و دماغ سب ہی کچھ تو رنگوں میں سمایا ہوا سامنے موجود تھا۔

پھر بھی اس نے چاہا کہ کہیں اپنی صورت دیکھے! اس نے ایک ٹین کے ڈبے کو جس میں اس کے رنگ دور دور کے شہروں سے آیا کرتے تھے۔ اُلٹ کر جھاڑا۔ دو جھینگر پھدک کر اس کی ناک پر پٹا کھا کر اُڑ گئے۔ مکڑی کا جالا اس نے کہنی سے جھاڑ کر اپنا منہ دیکھا۔ پہلے تو اسے کچھ نظر آیا جیسے سمندر کی تہہ میں باریک باریک جھاڑ اور پھندے سے ہوتے ہیں۔ یا جیسے آنکھوں میں پلکیں گھس جاتی ہیں تو پھیلا پھیلا سا دکھائی دیتا ہے، ویسا دکھائی دیا۔ پھر ایک بھیانک داڑھی اور پیاسی پیاسی آنکھیں دکھائی دیں۔ اوہ۔ یہ وہ خود تھا۔ وہ؟ وہ۔ جو۔ مگر ایسا کبھی

تھا ہی نہیں ایسا؟ اس نے ٹین کا ڈبہ اوندھا دیا اور بغیر آئینے کے اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے داڑھی تو خیر نظر آئی اور ایک آنکھ بند کرنے سے تھوڑی سی کالے دھبے والی ناک اور پھولی ہوئی مونچھ دکھائی دی۔ مونچھ۔ اگر قینچی ہوتی تو وہ ذرا ذرا سا مونچھ کو ویسا کر دیتا۔ رانی کہتی تھی چنّن کی مونچھوں سے چھینکیں آنے لگتی ہیں۔ خوں۔ خوں۔ وہ خود بھی ناک بجانے لگا۔ یہ تو خیر معلوم تھا کہ رتنا لنگوٹ پہنے تھا۔ کیا عجب دھوتی بھی ہو یا پہننے والا ہو کہ وہ آگیا مگر یہ چنّن اور اس کی گرد ڈھانی۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کمرے کی دیواریں گرد دھانی کی بنی ہوئی ہوں اور وہ اسے بھینچے ڈال رہی ہوں، وہ ایک پسی ہوئی مکھی کی طرح گرد دھانی کے ایک بڑے سے ڈھیر پر چپکا ہوا ہل رہا ہے۔ جب وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا اور ٹانگیں شل ہوگئیں تو اسٹول پر ٹک گیا پردہ اٹھا کر اس نے اپنی ادھوری محنت کو دیکھنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے داغ دھبے گھومنے لگے اور ایک دم ٹھہر گئے۔ شانے پالش کیے ہوئے چمڑے کی طرح چمکنے لگے اور آنکھوں میں نیلی، کالی، ہری روشنیاں گھومنے لگیں اور تل! یہ تل کہاں سے آیا۔ سانپ کی طرح گول کنڈلی مارے ابھرا ہوا تل۔ ٹمک ٹمک۔ ٹمک ٹمک۔ گھڑی کی طرح اس کا دل ہلنے لگا۔

وہ ایک دم اٹھا اور اس کے پیر رانی کی کوٹھری کی طرف اٹھ گئے۔ گندی میلی چھوٹے سے دروازے کی گھٹی ہوئی کوٹھری! وہ کل اسے اونچا کرلے گا۔ نہیں اونچا نہیں بلکہ جو دوسرا کمرہ ہے، جس میں خالی ڈبے پڑے ہیں وہ ٹھیک

ہے۔ وہ اندھیرے میں بڑھنے لگا۔ اس کا دل اب بھی گھڑی کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کوٹھری کی سیاہی دھلی ہوئی کالونچ کی طرح اس کے چاروں طرف لپٹ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ چارپائی سے ٹکرائے۔ پھر بان کے جھولے میں دھنس گئے۔ اس نے جلدی جلدی سارا پلنگ ٹٹول ڈالا ــــــ مگر رانی نہ تھی!

سارے بدن پر مچھروں نے لپٹ کر چیکنا شروع کر دیا۔ موٹے موٹے قہقہے لگاتے مچھر ــــــ اور پھر گرد دھانی کی سلیں کی سلیں اس پر ٹوٹ پڑیں۔ صبح اس نے چاہا کہ رانی چٹیا میٹ کر اس سے پوچھے کہ حرامزادی یہ رات کو کہاں گئی تھی مگر کوئی کہے گا کہ وہ راتوں کو اس کا پلنگ کیوں ٹٹولتا ہے!

وہ چپکا کام کرتا رہا اور رانی بھی آج نہ بولی۔ وہ چاہتا تھا کچھ تو بولے۔ شاید رات کے اُڑنے کا پتہ چلے مگر وہ منہ بنائے روٹھی بیٹھی تھی۔

"کیوں کیا تھک گئی؟" اس نے اسے مٹکی رکھتے دیکھ کر نرمی سے پوچھا۔ آج وہ اس سے لڑنا نہ چاہتا تھا۔

"اور کیا ــــ میں مٹی کی بنی ہوں؟" وہ اپنی کمر دونوں ہاتھوں سے دبانے لگی۔ چودھری کا جی چاہا کوئی نرم سی بات کہے مگر اسے اپنا انداز بدلتے ذرا شرم سی آئی۔

"لے بس اب سستنا چکی"۔ وہ سمجھتا تھا شاید وہ لڑے گی اور خیر۔ مگر رانی نے مٹکی لے کر پھر جسم کو ویسے ہی اکڑا لیا۔

آج رنگ تننا اُٹھتے جو رنگ لگا یا منہ چڑانے لگا۔ آج اس نے سوچا تھا

تل بھی بنا دے گا۔ یونہی تصویروں میں کیا تل نہیں ہوتے۔ مگر رنگوں کے مزاج بگڑتے دیکھ کر وہ ٹال گیا۔ جب رانی اُٹھ کر چلی تو گڑدھانی کا ٹکڑا اس کی دھوتی ہیں سے گر پڑا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی مگر چودھری کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے سر پر سائبان ٹوٹ پڑا۔

"یہ گڑدھانی۔!" اس نے غصے سے جھاگ اڑانے شروع کیے پہلے تو وہ ڑکی کہ اٹھا لے مگر چودھری کے تیور دیکھ کر وہ چل دی۔

"تم کھالو۔" اس نے غرور سے گردن اُٹھا کر کہا۔

چودھری پر مرگھٹ کا بھتنا سوار ہو گیا۔ وہ رانی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اور پھر ایک دم جوتے کی ایڑی سے اس نے گڑدھانی کو زمین پر رگڑ کر پیس ڈالا۔

دوسرے دن رانی خدا جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اس نے دو چار کپڑے لینے کی بھی تکلیف گوارا نہ کی۔ جیسی آئی تھی ویسی ہی پھر موت آئی کیچڑ میں ڑلنے کے لیے چل پڑی۔

چودھری کی تصویر نامکمل ہی رہ گئی۔ پانچ ہزار روپے ایک سیاہ دھبے کی صورت میں اس کے دماغ پر جم گئے۔ سیاہ دھبہ جیسے ننھا سا اُبھرا ہوا تل مگر کتنی بری جگہ تھا۔ یہ سیاہ جلا ہوا نشان! بالکل چودھری کے کلیجے میں!

اس کے بعد وہ اور بھی پریشان رہنے لگا۔ ڈر کے مارے وہ کسی سے کہتا بھی نہ تھا کہ رانی بھاگ گئی۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ کہیں کوئی کہے نہ کہ آخر بھاگ گئی تو کیا ہوا۔ وہ کیوں مرا جاتا ہے۔ لہٰذا دن گزرتے گئے وہ تصویریں بنانے کی

کوشش کرتا رہا۔ مگر اب کوئی چھ چھ آنے میں بھی اس کی تصویریں نہ لیتا تھا، کیونکہ اس قدر بھدے، ڈرائنے، سیاہ بھورے اور کالے رنگ شفق اور پھولوں میں بھرنے لگا تھا کہ لوگ اسے اُلو سمجھتے تھے۔ اس کے سارے رنگ گڈمڈ ہوکر خلا میں تبدیل ہو چکے تھے۔

اس کے بعد اور بھی غیر دلچسپ واقعات پیش آنے لگے لوگ رانی کے متعلق بار بار پوچھتے وہ کہہ دیتا نہ جانے کہاں گئی۔ مگر لوگ ایسے سیدھے سادے جواب کو کب پسند کرتے تھے۔

"چودھری رانی کو بیچ آیا"۔

"ایک سوداگر آیا تھا جو کئی ہزار دے کر لے گیا"۔

"رانی سے بُرا تعلق۔ ناجائز۔ کہیں پار کر دیا"!

جتنے منہ اس سے دونی باتیں۔ چودھری کی زندگی اندھیری کوٹھری بن گئی۔ معلوم ہوتا تھا دنیا اسے نگل کر کھا جانا چاہتی ہے۔ یہی نہیں۔ لطف زندگی جب آیا جب رانی ایک خون آلود گٹھڑی ایک الگ سے راستے میں رکھنی ہوئی پولیس کے ہتھے چڑھ گئی۔ فوراً گاؤں پر چڑھائی ہوئی اور چودھری کے رہے سہے حواس گم ہوگئے۔ رانی کے گم ہونے کا عقدہ بالکل آسانی سے کھل گیا اور چودھری ہکا بکا منہ پھاڑے رہ گیا۔ اف اس کی ساری عمر کی پاکبازی اور نیک نیتی یوں ناانصافی اور اندھا دھند کے ہاتھوں کچلی ہوئی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ خدا کو خواہ مخواہ کا اس سے بیر نہیں۔ وہ ایسے صاف بچ جائے گا۔ جیسے۔ جیسے سب بے گناہ بچ جاتے ہیں۔ سانچ کو آنچ کہاں۔ مگر کاش وہ شریک جرم ہی رہتا۔ یوں تو وہ مجرم تھا ہی

آخر اس نے پیدا ہو کر کون سا جرم کیا تھا؟

ہاں تو کاش وہ شریک جرم ہی رہتا۔ قید بھگتتا۔ مصیبتیں، دُکھ درد جھیلتا۔ دنیا بھر کی ذلتیں اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ ہنس ہنس کر گود میں لپک لیتا۔ اسے معلوم ہوتا کہ وہ یوں چھوٹے گا تو وہ کیوں گڑگڑا کر خدا کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کر کے دعا مانگتا ہاں یہ تو تھا کہ۔ ذرا تاہل۔ ہاں خیر! مگر خدا کیا اپنے بندوں کی کمزوری کو نہیں جانتا۔ اس نے یہ ساری کمزوریاں انسان کے پیچھے لگا دی ہیں۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ جب رانی سے باز پرس ہوگی اور سرکاری وکیل چاروں طرف سے منطق کے جال میں گھیرے گا تو وہ یہ داؤ چلے گی اور یوں آزاد یاد دوسرے معنوں کے ہیں برباد کر دے گی۔

"چودھری کا نہیں تھا۔ اس نے بھری کچہری میں حلف اٹھا کر کہہ دیا۔"

"چودھری تو ہیجڑا ہے۔" اس نے لاپرواہی سے کہا "ذرا نا سے پوچھو یا چنن سے۔ اب مجھے کیا معلوم ولد" وہ اپنی پرانی ادا سے اٹھلائی۔ ایک خاموش گرج اور جھلک کے ساتھ سیاہ پہاڑ چودھری کی ہستی پر پھٹا اور دور سیاہی میں اور بھی گول۔ ابھرا ہوا لفظ پھرکنی کی طرح گھومنے لگا۔

چودھری اب بھی سڑک کے کنارے کوئلے سے لکیریں کاڑھا کرتا ہے۔ لمبی بکونڈ گول۔ جیسے جلا ہوا داغ۔

ایک شوہر کی خاطر

اور یہ سب کچھ بس ذرا سی بات پہ ہوا۔ مصیبت آتی ہے تو کہہ کر نہیں آتی۔ پتہ نہیں وہ کون سی گھڑی تھی کہ ریل میں قدم رکھا کہ اچھی بھلی زندگی مصیبت بن گئی۔ بات یہ ہوئی کہ اگلے نومبر میں جودھپور سے بمبئی آ رہی تھی۔ سب نے کہا۔ "دیکھو پچھتاؤ گی۔ مت جاؤ نہ۔" مگر جب چیونٹی کے پر نکلتے ہیں، تو موت ہی آتی ہے۔

سفر لمبا اور ریل زیادہ ہلنے والی، نیند دور اور ریت کے چھپاکے اوپر سے تنہائی۔ سارا کا سارا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ جیسے قبرستان میں لمبی لمبی قبریں ہوں۔ دل گھبرانے لگا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے تنگ آ گئی۔ دوسرا لیا۔ اس میں بھی وہی خبریں!

دل لوٹ گیا۔ کاش میں قبرستان میں ہی ہوتی، بلا سے مردے نکل پڑتے بنچوں کو دیکھ دیکھ کر جی ہول رہا تھا۔ "کاش کوئی آ جائے۔ کاش۔ کاش۔"

میں نے دعا مانگنی شروع کی۔

ایک دم سے جو ریل رُکی تو ایک دم سے جیسے ٹپڑیاں ٹوٹ پڑیں۔ انسان تو کم آئے بچے اور ٹپلیاں زیادہ سب بچے ایسے جو قحط زدہ گاؤں سے آ رہے تھے کہ آتے ہی خوراک پر پل پڑے۔ دودھ پینے والوں کو تو خیر تیار معاملہ مل گیا اور وہ جُٹ گئے۔ باقی کے تلملانے اور تڑپنے لگے۔ ٹپلیاں اس قدر بے ہنگم اور فضول جگہ گھیرنے والی وضع سے بندھی تھیں کہ کسی کل بیٹھتی ہی نہ تھیں۔ ایک سنبھالی تو دوسری تیار۔ میں علیحدہ پڑی پر اس زاویہ سے بیٹھی تھی کہ گٹھڑی گر سے تو میری ریڑھ کی ہڈی بچ جائے۔ مجھے اپنے جسم میں بس ریڑھ کی ہڈی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ کہتے ہیں کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے تو آدمی لونڈرا ہو جاتا ہے۔

"کہاں جا رہی ہو؟" بچاری ہم سفر نے گٹھڑیوں کی طرف سے غیر مطمئن ہوتے ہوئے بھی نہایت فکر مند ہو کر پوچھا۔

میں نے جلدی سے بتایا اور پھر ان کی توجہ اس بجنی گٹھڑی کی طرف منعطف ہو گئی جو شاید برتنوں کی تھی اور ذرا سی ٹھیس سے گرنے کو تیار۔ اگر اتفاقیہ ذرا سا ہاتھ لگ جاتا تو برتن اس تیزی سے آپس میں ٹکراتے، کہ جی گھبرا اُٹھتا۔

"کہاں سے آ رہی ہو—؟"

میں نے ذرا کم مستعدی سے بتایا۔

"میکے جا رہی ہو؟"

جب تک شادی نہ ہوئی ہو جب تک جگت میکہ ہی ہے اور کہیں بھی نہیں یعنی میکے اور سسرال کا سوال ہی نہیں۔ لہٰذا میں ذرا چکرائی۔ سوچا اندازاً کس صوبہ میں شادی ہونے کا خطرہ ہے۔

"میاں کے پاس جا رہی ہو؟"

"نہیں!" میں نے چاہا موضوع بدل جاتا تو اچھا ہوتا۔ خواہ مخواہ کون ہمدردی وصول کرے۔

"تو پھر سسرال جا رہی ہو گی۔ کیوں؟" ذرا ان سوالوں کے جواب بہت فلسفیانہ ہوتے۔

"نہیں ــــ تو ــــ میں بمبئی جا رہی ہوں ــــ شادی ــــ شادی تو نہیں ہوئی۔" میں نے ذرا دل میں کچھ حقیر ہو کر کہا۔ حالانکہ شادی کے خلاف کالج کے مباحثہ میں مجھے اوّل انعام ملا تھا اور اب بھی۔ خیر اب تو۔ ہاں تو۔ میں نے کہا۔

وہ متحیر ہو کر اتنی زور سے اُچھلیں کہ بچے کے منہ سے دودھ چھوٹ گیا۔ اور وہ مذبوحہ بکری کی طرح چیخا۔ میں دھیان بٹانے کو ان کی توجہ بچے کیطرف کرنا چاہی۔ مگر وہ ٹٹول ٹٹول کر بچے کی ناک میں دودھ ٹھونسنے لگیں سادریں یہاں کچھ لکھنا نہیں چاہتی کہ مجھے انہوں نے کس رحم اور مہربانی بھری آنکھوں سے دیکھا۔ انہیں مجھ سے محبت سی آنے لگی اور میں ڈری کہ وہ کہیں مجھے چمٹا کر رو نہ پڑیں۔ ان کا دل بہلانے کے لیے میں نے چنے والے کو بلایا۔ مگر وہ دلیسی ہی اُداس رہیں۔ انہوں نے مجھے دو ایک داؤ پیچ ایک اچھا سا شوہر

پھانسنے کے بنائے جو بعد میں تجربہ سے قطعی بے کار ثابت ہوئے۔

میری دعا شاید ضرورت سے زیادہ قبول ہو گئی۔ یا شاید میری خدا کے حضور میں کاتبین کی غلطی سے دوبارہ عرضی پیش ہو گئی کہ ایک موج انسانوں کی پھر آئی، اس موج میں بڑے بڑے ریشمی برقعے اور چھتریاں زائد تعداد میں تھیں۔ ان کے ساتھ گنے بھی تھے۔ جن کے ٹکڑے ناپ ناپ کر اتنے بڑے کیے گئے تھے کہ ریل کے کسی کونے میں ٹھیک سے نہ رکھے جا سکیں۔ ان کے بستر اور صندوق کچھ ایسے تھے جو کسی ہٹری کے اوپر یا نیچے کسی انداز سے بھی نہ رکھے جا سکتے تھے۔ ان بیویوں نے آتے ہی ریل میں ہل چل مچا دی۔ صندوق اور پلندے گھسیٹ کر تباہ کر دیا۔ پہلے والی مسافرہ کی ضدی پوٹلیاں جو شاید تاک میں تھیں کہ بچوں اور عورتوں پر گریں اور وہ ایک دوسرے پر گریں۔

"کہاں جا رہی ہو؟" یہ بھی کچھ پریشان تھیں۔

بتایا۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟" بولیں۔ حالانکہ ابھی ٹھیک سے جمی بھی نہ تھیں۔ برقعہ پھانسی لگا رہا تھا۔ مگر بتایا۔

"میکے جا رہی ہو یا سسرال؟" کاش مجھے معلوم ہوتا۔ مگر چوکنے کا موقع نہ تھا۔

"سسرال!" ایسے کہا کہ وہ ہم سفر جو پہلے جرح کر چکی تھیں نہ سُن پائیں۔

"کیا کرتے ہیں میاں؟"

اب میں نے سوچا کہ کچھ تو کرتے ہی ہوں گے۔ بے کار تو کاہے کو پھرتے ہوں گے۔ مگر کاش وہ مجھے بھی بتا دیتے تو اچھا ہی تھا۔ بہرحال نکھٹو تو نہ ہوں گے پہ ....

وہ خود ہی بولیں "ریلوے میں ہیں۔"

"ہاں ——— ہاں۔" میں نے پُرشوق لہجہ میں انہیں یقین دلایا۔ "یہ ٹھیک رہا۔"

میں نے سوچا، ریلوے کا آدمی خوب رہے گا۔ مزے سے مفت کے ٹکٹ تو ملیں گے۔ ہندوستان بھر میں گھوم لو اور مجھے وردی بھی ان کم بختوں کی کچھ پسند ہے۔ خصوصاً وہ سیٹی اور ٹوپی ——— لال ہری جھنڈی ——— اچھا ہی ہوا جو یہ بچاری مل گئی۔ ورنہ اپنے کو تو کبھی گارڈ بابو وغیرہ کا خیال بھی نہیں آیا۔ اے ہاں سچ تو ہے۔

"کون کام پہ ہیں ——— وہ ریل میں ——"

کسی ٹھیک ہی کام پر ہوں گے ——— اور کیا مجھے خیال ہی نہ آیا، کہ گارڈ بابو کی بیوی بننا تو آسان ہے۔ مگر یہ تفصیل تو ذرا بھاری خوراک ہے ——

"پھر بھی کیا کام کرتے ہیں ریل میں تو ہزار سے زیادہ کام ہیں ——"

"اے ——— ٹی ٹی ——— قلی ———" میں ایسی بولا ڈی کہ کچھ بڑ... پڑا ——— سامنے ایک قلی بڑا سا بنڈل ——— ایک بستر ——— آدھی درجن صر...

کی سیڑھی اور دو لوٹے لیے چلا آرہا تھا، اور ایسے بن رہا تھا جیسے بہت بھاری ہیں۔

• قلی ——— تمہارا میاں قلی ہے ——— "حیرت کا ایک دورہ ان پہ بھی پڑا۔ میں چاہتی تھی۔ ذرا ہم آہستہ آہستہ گفتگو کریں۔ ورنہ کہیں ہم پہلی ہمسفر نہ سن لیں۔ ان کا بچہ سکون سے دودھ پی رہا تھا۔ مگر ایک دفعہ بات نکل جائے تو پھر بھی اس پہ ہی جم جاتی ہوں اور یہاں تو جمنے کے ویسے ہی لالے پڑتے تھے۔

• ہاں ——— آں قلی ہی سہی پھر تمہیں کیا ——" میں نے ذرا برا مان کر کہا۔

"تمہارا میں ——— میاں قلی ——"

"ہاں پھر ——— تم کیوں جلو ——— تمہارا جی چاہے تو تم بھی قلی سے کر لو ——— دس قلیوں سے کرو۔ کون روکتا ہے۔ اتنے تو سستے ہیں قلی۔"

مگر میں ذرا چپ رہی اور مظلوم سی صورت بنا لی۔

بولیں ——" کیسے ہو گئی تمہاری شادی قلی سے ؟"

اور میں سوچنے لگی قلیوں سے کس طرح شادیاں ہوتی ہیں۔ میں نے چاہا دل سے کچھ گھڑوں کسی شادی کا حال ——— مگر کسی قدر غیر دلچسپ معلوم ہوا۔

پھر میں نے کہا ——" ایک قلی تھا۔"

انہوں نے توجہ سے سنا۔

• وہ رہا کرتا تھا ——" میں چاہتی تھی وہ میری ہر بات پر "ہوں" کریں یا

کم از کم سر ہلائیں۔

" پھر کیا ہوا کہ ایک دن ـــــ کہ ـــــ " کاش مجھے معلوم ہوتا ۔ اس وقت کوئی قصہ بھی تو نہ یاد آیا۔

" وہ لے جا رہا تھا سامان ـــــ " میں نے چاہا وہ پوچھیں کس کا ۔ اور انہوں نے پوچھا۔

" ایک نہایت ہی خوب صورت لڑکی کا ـــــ پھر وہ لڑکی ـــــ وہ لڑکی عاشق ہو گئی ۔"

" کون لڑکی ؟"

اسے یہ تو معلوم ہی نہیں پڑا ـــــ خیر کیا مضائقہ ہے ۔ کوئی بات نہیں ـــــ یقیناً ہوگی ہی کوئی لڑکی ـــــ کوئی خوبصورت سی لڑکی ہوگی ۔

" تو وہ قلی پہ کیوں عاشق ہو گئی ؟"

" وہ عاشق یوں ہو گئی ـــــ کہ ـــــ ارے بھئی اب یہ کیا معلوم کوئی تو وجہ ہے ہی عاشق ہونے کی ـــــ وہ مسکرایا ہوگا اسے دیکھ کر ۔"

اتنے میں ایک نہایت بھیانک قسم کا بابو مجھے دیکھ کر مسکرایا اور میں ڈری۔ کہ کہیں سچ مچ عاشق نہ ہونا پڑے ۔ ابھی انٹرویو میں جانا ہے ۔ سنتے ہیں عشق میں بڑی حالت خراب ہوتی ہے ۔ بھلا پردیس میں کہاں عاشق ہوتی پھروں گی جسیم بھائی کے یہاں جانا ہے اور وہ ہیضہ کے بعد بس عشق سے گھبراتے ہیں خیر بات گزر گئی ہو گی ۔

"اے بہن یہ کیا کہہ رہی ہو ـــــ کون لڑکی کس کا عشق ۔ میں کہتی ہوں تمہاری شادی کیسے ہوئی ۔"

"ہاں! ـــــ ان بچاری کی شادی نہیں ہوئی ـــــ آخر کو پہلی مسافرہ کو پتہ چل ہی گیا نا ـــــ کتنا مردی سے کہا آہستہ بول آہستہ ـــــ مگر یہ لیجیے وہ قلعی بھی ہاتھ سے گیا ۔

"جب نہیں ہوئی تھی ـــــ" میں نے چاہا شاید مان جائیں ۔

"اوئی ۔ کیا ریل میں بیٹھے بیٹھے ہوگی ۔"

کاش ایسا ہو سکتا ـــــ کاش گرما گرم چائے کی بجائے لوگ امیر امیر کماؤ شوہر بیچتے ہوتے، تو سفر کے لیے میں ضرور لے لیتی ـــــ پھر چاہیے ـــــ پھر دیکھا جاتا ۔ اور میں نے ارادہ کر لیا کہ بھئی اب کے ایک مناسب قسم کا میاں ڈھونڈنا چاہیے ۔ اب اس میں کیا ٹوٹا ہے اپنا ـــــ ٹھیک ہی رہے گا ۔ بلا سے ہر مسافر سے نئے نئے جھوٹ تو نہ بولنے پڑیں گے کہ بھئی کسی نے پوچھا فوراً میاں حاضر ۔

"ارے بھئی اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں ۔" وہ میرے مستقبل سے ناامید ہو کر بولیں ۔

"موٹر مانگتے ہیں گاڑی گھوڑا دو ـــــ اور بھئی کماؤ ہوں جب ہی نا ۔ ایسے ملے جاتے ہیں کماؤ لڑکے ۔"

میں رنجیدہ ہو گئی ـــــ آخر یہ کماؤ لڑکے کیوں نہیں ہوتے ـــــ کم بخت اچھے لڑکے پہلے زمانے میں کتنے ہوتے تھے، مولی گاجر کی طرح

پر اب چاہو کہ آنکھ میں لگانے کے لیے اچھا لڑکا مل جائے تو نہیں ۔ اس لڑائی نے تو اجاڑ کر رکھ دیا، چلو بھئی پہلے لڑکے تو بھتے کماؤ بھئے یا نکھٹو ـــــ پر اب تو جسے دیکھو لڑائی پہ چلا آ رہا ہے ـــــ لو صاحب یہاں تو بیویاں طعنے دے رہی ہیں اور لڑکے ہیں کہ مرنے کٹنے پہ تلے ہیں۔

"تم پھر شادی کیوں نہیں کر لیتیں ۔" ایک بولی۔

"جیسے آپ کی مرضی ـــــ" میں نے اس معصوم لڑکی کی طرح دیکھا جس سے والدین شادی طے کرنے کے بعد روشن خیال بننے کے لیے رائے لیتے ہیں۔

"کب کرو گی پھر اب نہیں کرو گی تو ؟"

"اب ـــــ یعنی ابھی ـــــ میرے خیال میں ـــــ تو ـــــ اگر جنکشن تک ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔"

"کیا ؟"

"یہی کہ ـــــ جب آپ کی مرضی ہے تو پھر کیوں اس نیک کام میں دیر کی جائے۔"

"کیسا نیک کام ؟ ـــــ کیا کہہ رہی ہے لڑکی ؟" ـــــ بہت ہی گھبرا گئیں۔

"میں نے پوچھا ـــــ بھئی شادی کیوں نہیں کرتیں تم ۔" دوسری بولیں۔

"تم کیوں نہیں کرتیں شادی ——— بس ؟" ——— میں اب کافی جل اُٹھی تھی ——— حالانکہ ان کا بچہ مسلسل دودھ پی رہا تھا۔ مگر میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

"اُدئی ——— معلوم ہوتا ہے کہ دماغ بھی خراب ہے ———" وہ بچے کو اور واضح طور پر سامنے لائیں ہے۔ تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ صرف گود میں سو رہا ہے۔

"تو اچھا تمہاری شادی ہو گئی ——— کب کی تم نے شادی ؟ میں نے بہت تمکنت سے پوچھا۔

"ہمارے ماں باپ نے کی ہماری شادی۔ ہم خود کیوں کرتے۔"

"تو آپ شادی کے خلاف ہیں ——— ٹھیک ہے ——— بالکل ٹھیک ——— میرے ماں باپ نے شادی کی ——— جاہل انسان !" اس کے بعد وہ کچھ مکدر ہو گئیں اور غمگین ہو کر ناشتہ دان میں سے امرتیاں نکال کر غم غلط کرنے لگیں۔

اے خدا تو جب دعائیں قبول کرنے پر آتا ہے تو یوں دعا قبول کرتا ہے ؟ تیرے بندوں کو کسی کل چین نہیں۔ یہ تیری ناچیز بندی تنہا تھی۔ اس نے دوسرا یت چاہی تو تو نے یوں عذاب کی طرح مسافر نازل کرنا شروع کیے اور مسافروں سے زیادہ اسباب۔ ویسے بھی ہمیں کیا حق کہ بے تاب تیری مصلحت میں دخیل ہوں مگر پروردگار اتنا تو سوچا ہوتا کہ انسان میں تو نے جتنی برداشت دی ہے۔ اتنا ہی بوجھ لاد سکتے ہیں

ہم تو بس۔

اور میں ڈری کہ اگر دعاؤں کے قبول ہونے کا یہی ڈھنگ رہا، تو کہیں وہ شوہر کے لیے بھی جو ابھی ابھی دعا مانگی تھی اس کا بھی کچھ ایسا ہی قصہ نہ ہو اور لے چلا چل ایک پہ ایک! میرا تو دم ٹوٹ جائے گا! میں ایک کے ہی قمیض میں بٹن لگا دوں اور چائے بنا دوں تو بہت جانو۔ مجھ سے بھلا اتنے کا ہے کو جھیلے جائیں گے۔ بسمت مٹی ویسے ہی ہوں۔ اب اتنے میاؤں کو کون میرے بیٹھ کے بھگتے گا۔ کہتے ہیں کہ ڈاک خانے میں اگر بھولے سے غلط خط پڑھا جائے تو تھوڑی سی رشوت لے کر واپس لے سکتے ہیں۔ کاش دعاؤں کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی انتظام ہوتا۔ مگر دعا ایک دفعہ مانگی جا چکی تھی اور پے در پے قبول ہو رہی تھی۔

نئی ہم سفر بہت ہی خلیق معلوم ہوتی تھیں اور ضرورت سے زیادہ رقیق القلب کچھ نازک سی شاعرانہ بیماری کچھ آہستہ آہستہ بولنے کی عادی۔ مجھے ان پر بے تاب پیار آنے لگا۔

"حیدر آباد جا رہی ہیں آپ" انہوں نے بڑے وثوق سے پوچھا۔ میں ڈری کہ انکار کر دوں گی تو خفا ہو جائیں گی۔ لہذا بڑی عاجزی سے انکار کیا اور بتایا کہ بمبئی جا رہی ہوں۔

"احمد آباد سے آئی ہوں گی"۔ کس ہوشیاری سے وہ پرانی بوتلوں میں نئی دوا بھر بھر کر سر سہلا کر پلا رہی تھیں مگر ان کا چہرہ اس قدر رویا ہوا سا تھا کہ دل دکھانے کی ہمت نہ پڑی۔

میں نے بتایا۔

"پڑھتی ہیں وہاں۔"

"جی نہیں! انٹرویو کے لیے جا رہی ہوں۔"

"میرے ایک چچا کے سالے کی خالہ بھی بمبئی میں رہتی ہیں۔ ان سے ملیے گا۔"

میں نے وعدہ کر لیا۔ بھلا میں کہاں ان کے چچا کے سالے کی خالاؤں کو ڈھونڈتی!

"وہاں آپ کے والد والدہ ہیں۔"

"نہیں۔ میرے۔۔۔" بولنے ہی نہ دیا۔ خود بولیں۔

"اچھا آپ کے شوہر ہوں گے!"

گھن! وہ دیکھیے گھما پھرا کر وہی ایک ٹانگ مرغے کی شوہر — شوہر ہندوستان کے شوہر اس قدر مرکھنے ناکیں کاٹ لیں، طلاقیں دے دیں۔ بڑی مشکل سے ملیں اور ملیں تو نکھٹو! سنڈی بازی کریں، جوا کھیلیں مگر بیویاں ہیں کہ واری جا رہی ہیں۔ جسے دیکھیے شوہر کے ذکر میں غلطاں جسے دیکھیے اپنے یا پرائے شوہر کا رونا رو رہی ہیں۔ کنواریاں ہیں شوہر کے گیت گا رہی۔ بیاہیاں ہیں پرتیم پر فدا اور یہ پرتیم کتنے خون تھکوا لے دے رہے ہیں۔ ان مظالم معشوقانہ پہ تو یہ حال ہے اگر ذرا لاڈ کر لیتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں نے سوچا میاؤں کے ظلم میں بھی کچھ مصلحت ہے۔

"کہاں رہتی ہیں آپ بمبئی میں — بچے ہیں آپ کے — " ہیں تو سوچ میں پڑی تھی اور وہ میاں کے بعد بچوں پر اتر آئیں۔

"آٹھ" میں نے پلیٹ فارم پر کتے گنتے ہوئے کہا۔ یہ ریلوں کے ساتھ مسافروں سے زیادہ کتے کہاں سے آتے ہیں!

"ہاں — کیوں آپ کیوں بُرا مانتی ہیں؟ یقین نہ آئے تو اتر کر گن لیجیے۔"

"اب میں راستہ میں کیسے اتر دوں — ہاں انشاءاللہ کبھی آنا ہوا میرا چچا کے سالے کی خالہ کے یہاں تو — مگر بہن معلوم تو نہیں ہوتا منہ سے۔"

"منہ سے معلوم ہی کیا ہوتا ہے؟" میں نے فلسفیوں کے انداز میں کہا۔ جب دنیا سے مجھے نفرت ہونے لگتی ہے اور ہر چیز نیم مردہ اور اداس سی معلوم ہوتی ہے تو میرے دماغ میں فلسفہ بھرنے لگتا ہے۔

"شادی کو کتنے برس ہوئے۔" انہوں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"چار برس تین مہینے اور . . ."

"اور آٹھ بچے؟ — اے بہن میں سمجھتی تھی چلو ہوں گے — مگر —"

وہ بہت غم زدہ سی ہو گئیں۔ مجھے رحم آگیا۔ مگر میں نے تہہ کر لیا کہ کچھ ہو جائے اب اور نہیں دبوں گی ورنہ بچوں کے بعد یہ نواسے پوتے بھی میرے سر پر منڈ دیں گی اور وہ بیویاں جو میرے حالِ زار سے واقف ہیں اونگھ نہ چکیں — پھر خواہ مخواہ لے دے پڑے گی۔ آٹھ بچوں سے

ویسے ہی روح قبض ہوئی جارہی تھی۔

"ہاں ہاں کہتی تو ہوں۔ آٹھ۔"

"ماشاءاللہ سب زندہ ہیں۔ مگر بہن یہ ہوئے کیسے۔"

"کیسے ہوتے ہیں۔ دنیا جہاں میں ہوتے ہیں۔ ویسے ہی ہوتے ہوں گے۔"

"میرا مطلب ہے۔ چار سال میں۔"

"ہاں میں سمجھی۔ اچھا یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں آپ تو۔ یہ ہوا کبھی دو کبھی تین۔ اور۔"

"بس بس۔" وہ لرزیں۔ اور مجھے بُرا لگا کہ آخر یہ کون ہوتی ہیں۔ بُرا ماننے والی۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، آخر انہیں کیا چاہیے۔ کوئی ایک بچہ دے چاہے ایک دم دم دس۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ پچھلے ملاقاتی جاگ اُٹھے۔

"سنا بہن ان کے دو دو تین تین ایک ساتھ ہوئے۔ بچے۔" انہوں نے شکایت کی اور وہ گھبرا کر اپنے بچے گننے لگیں۔ کیونکہ سوائے بچوں کے انہوں نے کچھ نہیں سنا۔

"کیا قصہ ہے۔" دوسری بولیں۔

جب معاملہ خوب سمجھا دیا گیا تو تینوں بگڑ کھڑی ہوئیں۔

"ابھی کہتی تھیں شادی نہیں ہوئی اور ابھی دو دو تین تین بچے ہونے لگے۔" ایک نے ڈانٹا۔

"میری کیوں نہ ہوتی شادی خدا نہ کرے۔ تمہاری ہی نہیں ہوئی ہوگی۔
بات بگڑنے لگی۔ پاس سے ایک ٹکٹ چیکر گزرے یا جانے کون تھے نظر کیجیے تو ہر ریل کا نوکر ٹکٹ چیکر ہی سا لگتا ہے۔ میں نے جھک کر ان سے وقت پوچھا وہ بتانے کے بعد مسکرانے لگے اور مسکراتے ہوئے چل دیئے۔

"تم تو کہتی تھیں اکیلی جا رہی ہو۔ اور یہ تمہارے۔ ۔ ۔"

"یہ میرا نواسہ ہے۔" قبل اس کے کہ وہ کوئی رومانٹک سا رشتہ قائم کرتیں۔ میں نے خود ہی اپنے لیے فیصلہ کر لیا۔

"نواسہ؟" تینوں چیخیں۔

اللہ یہ آج ان لوگوں کو مجھ سے کہاں کا بیر پڑ گیا تھا کہ میرے کنبے کے ہر فرد کے ذکر پر بن بن کر چونک رہی تھیں۔

"کیا کہتی ہے لڑکی — یہ تیرا نواسہ کہ۔ ۔ ۔"

"تو آپ کو کیا؟"

"بہن بال تو سفید رکھے تھے ان کے۔" دوسری بولیں۔

"نزلے سے ہو گئے ہوں گے۔" میں بڑبڑائی۔

اور پھر میں بالکل کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ خودکشی کو دل نہ چاہا، چلتی ریل سے اترنے کی پریکٹس نہ کی۔ زمین سخت اور آسمان دور۔

ہونہار بات ہو کر رہتی ہے جب زائد سامان تلوا کر بلٹی دینے لگی تو کلرک نے کہا: "آپ کا نام۔ شوہر کا نام؟"

"چغد!" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"چوکھے ــــــ؟ کیسا اونڈا نام ہے ۔" اس نے متعجب ہو کر کلرک کے کہنی ماری۔

یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ جب اس نے مجھے مسز چوکھے بنا کر رسید دی تو میں نے اس کے منہ پر اپنا بٹوا مع ایک عدد موٹی کتاب کے کھینچ مارا۔ اور یہ سب کچھ ہوا بس ایک شوہر کی خاطر!

بڑی ممانی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ سارے خاندان کو شجاعت ماموں کی دوسری شادی کی فکر ڈسنے لگی۔ اُٹھتے بیٹھتے دلہن تلاش کی جانے لگی۔ جب کبھی کھانے پینے سے نمٹ کر بیویاں بیٹوں کی برّی یا بیٹیوں کا جہیز ٹانکنے بیٹھتیں تو ماموں کے لیے دُلہن تجویز کی جانے لگتی۔

"ارے اپنی کنیز فاطمہ کیسی رہیں گی؟"

"اے ہے بی، گھاس تو نہیں کھا گئی ہو، کنیز فاطمہ کی ساس نے سُن لیا تو ناک چوٹی کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ دیں گی ـــــ جوان بیٹے کی میت اُٹھتے ہی وہ بہو کے گرد کُنڈل ڈال کے بیٹھ گئیں۔ وہ دن اور آج کا دن دہلیز سے قدم نہ اُتار نے دیا۔ نگوڑی کا میکے میں کوئی مرا جیتا ہوتا تو شاید کبھی آنا جانا ہو جاتا ہے۔"

"اور بھئی شجن بھیا کو کیا کنواری نہیں ملے گی جو جھوٹا پتل چاٹیں گے

لوگ بیٹیاں تھال میں سجا کے دینے کو تیار ہیں ــــــ چالیس کے تو لگتے بھی نہیں۔" اصغری خانم بولیں۔

"اوئی خدا خیر کرے ابو ا پورے دس سال نگل رہی ہو! اللہ رکھے، خالی کے مہینے میں پورے پچاس بھر گئے۔۔۔"

اللہ! بے چاری امتیازی پھپتو بول کے پچھتا ئیں۔ شجاعت ماموں کی پانچ بہنیں ایک طرف اور وہ نگوڑی ایک طرف اور ماشاء اللہ سے پانچویں بہنوں کی زبانیں بس کندھوں پر پڑی تھیں، یہ گز گز بھر کی۔ کوئی مچیٹا ہوجانا بس پانچوں ایک دم مورچہ باندھ کے ڈٹ جاتیں۔ پھر مجال ہے جو کوئی مغلانی، پٹھانی تک میدان میں ٹک جائے۔ بے چاری شیخانیوں سیدانیوں کی تو بات ہی نہ پوچھئے ــــــ بڑی بڑی دل گردے والیوں کے چھکے چھوٹ جاتے۔

مگر امتیازی پھپتو بھی ان پانچ پانڈوؤں پر سو کوروؤں سے بھاری پڑتیں۔ ان کا سب سے خطرناک حربہ ان کی چنچناتی ہوئی برمے کی نوک جیسی آواز تھی۔ بولنا جو شروع کرتیں تو ایسا لگتا جیسے مشین گن کی گولیاں ایک کان سے گھستی ہیں اور دوسرے کان سے زن سے نکل جاتی ہیں جیسے ہی اُن کی کسی سے تکرار شروع ہوتی سارے محلے میں ترنت خبر دوڑ جاتی کہ بھائی امتیازی بوا کی کسی سے چل پڑی اور بیویاں کوٹھے لانگتی، چھجے پھلانگتی دنگل کی جانب ہلہ بول دیتیں۔

امتیازی پھپتو کی پانچوں بہنوں نے وہ ٹانگ لی کہ عزیب مکو بن گئیں،

ان کی منجھلی بیٹی گوری خانم اب تک کنواری دھری تھیں۔ چھتیسواں سال چھاتی پر سوار تھا، مگر کہیں نصیبہ کھلنے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ کنوارے ملتے نہیں، بیاہے رنڈوے نہیں ہوتے۔ پہلے زمانے میں تو ہر مرد تین چار کو ٹھکانے لگا دیتا تھا۔ مگر جب سے یہ ہسپتال اور ڈاکٹر پیدا ہوئے ہیں، بیویوں نے مرنے کی قسم کھالی ہے، جسے دیکھو عاقبت کے بوریئے سمیٹنے پر تلی ہوئی ہے۔ بڑی ممانی کی بیماری کے دنوں میں ہی امتیازی پھپو نے حساب لگا لیا تھا، لیکن ان کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ تھا کہ دولہا جو کے لیے بھی کنوئیں میں بانس ڈالنے پڑیں گے۔

شجاعت ماموں کی عمر کا مسئلہ بڑی نازک صورت اختیار کر گیا۔ قمر آرا اور نور خالہ کے لیے تو وہ ابھی لڑکا ہی تھے۔ اس لیے وہ تو مارے ہول کے برسوں کی گنتی میں بار بار گھپلا ڈال دیتیں۔ کیوں کہ ان کی عمر کا حساب لگ جانے سے خود خالاؤں کی عمر پر ستر پڑتی تھی، لہٰذا پانچوں بہنیں بالکل مختلف سمت سے حملہ آور ہوئیں۔ انہوں نے فوراً امتیازی پھپو کے نواسے داماد کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس کا تذکرہ پھپو کی دکھتی رگ تھا، کیوں کہ وہ ان کی نواسی پر سوت لے آیا تھا۔

مگر ہماری پھپو بھی کھری مغلانی تھیں۔ جن کے والد شاہی فوج میں برق انداز تھے۔ وہ کہاں مار کھانے والیوں میں سے تھیں۔ جھٹ پینترا بدل کر وار خالی دیا اور شہزادی بیگم کی پوتی پر ٹوٹ پڑیں جو کھلے بندوں خاندان کی ناک کٹوا رہی تھی، کیوں کہ وہ روز ڈولی میں بیٹھ کر دھنکوٹ

کے اسکول میں پڑھنے جایا کرتی تھی۔ اس زمانے میں اسکول جانا اتنا ہی بھیانک سمجھا جاتا تھا جتنا آج کل کوئی فلموں میں ناچنے گانے لگے۔

شجاعت ماموں بڑے معقول آدمی تھے۔ نہایت ستھرا لفنٹرا، چھریرا بدن، درمیانہ قد، امتیازی پھپو سارے میں کہتی پھرتی تھیں کہ خضاب لگاتے ہیں، مگر آج تک کسی نے کوئی سفید بال ان کے سر میں نہیں دیکھا۔ اس لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ خضاب لگانا کب شروع کیا۔ یوں دیکھنے میں بالکل جوان لگتے تھے، واقعی چالیس کے نہیں جچتے تھے۔ جب ان پر پیغاموں کی بہت زور کی بارش ہوئی تو بوکھلا کر انہوں نے معاملہ بہنوں کے سپرد کر دیا، اتنا کہہ لونڈیا اتنی چھچھوری نہ ہو کہ ان کی بیٹی لگے اور ایسی کھوسٹ بھی نہ ہو کہ ان کی اماں لگے۔

بڑی ڈھونڈ مچی۔ آخر قرعہ رخسانہ بیگم کے نام پڑا۔

' اوئی، کیا خونیا نا سا نام!' امتیازی پھپو کو کچھ نہ سوجھا تو نام ہی میں کیڑے نکالنے لگیں، مگر بہنوں نے ایسا مورچہ کسا کہ ان کی کسی نے نہ سنی۔

لونڈیا سولہ سے ایک دن زیادہ کی ہو تو سو جوتے صبح، سو جوتے شام، اوپر سے حقہ کا پانی: مگر ان کی کسی نے نہ سنی۔ وہ اپنی گوری بیگم کی نائدہ ہار نگانے کے لیے خواہی نہ خواہی ڈنڈ مچاتی تھیں۔

رخسانہ بیگم تھیں کہ بس کوئی دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔ جیسے پہلی کا نازک سا شرمایا ہوا چاند کسی نے اتار لیا ہو، شکل دیکھتے جاؤ پر جی نہ بھرے

نور تو پانچویں کے بعد چھٹا پھول نہ چڑھے۔ رنگت ایسی جیسے دمکتا کندن ـــــ جسم میں ہڈی کا نام نہیں جیسے سخت میدے کی لوئی پر گاسے کا مکھن چپڑ دیا ہو ـــــ نسوانیت اس غضب کی جیسے درجن بھر عورتوں کا ست نچوڑ کر بھر دیا ہو۔ گرم گرم لپٹیں سی نکلتی تھیں، شاید بقول پھپو سولہ برس کی ہوں گی، مگر انتیس تیس کی اٹھان تھی، بہنوں نے ماموں کو پچیسواں سال بتایا تھا۔ انہیں ذرا سا تکلف تو ہوا مگر پھر ٹال گئے کمسنی تو کوئی برا جرم نہیں۔

سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ بے انتہا مفلس گھر کا بوجھ تھیں، دونوں طرف کا خرچہ ماموں کے سر رہا۔ جب رخسانہ ممانی بیاہ کر آئیں تو انہیں غور سے دیکھ کے ماموں کے پسینے چھوٹ گئے۔

"باجی، یہ تو بالکل بچی ہے!" انہوں نے بوکھلا کر کہا۔

"اوئی خدا خیر کرے! اے میاں تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔

مرد ساٹھا اور پاٹھا۔ بیوی بیسی اور کھیسی۔ دو چار بچے ہوتے نہیں کہ ساری قلعی آتر جائے گی۔ گو عورت میں نہ سولہ سنگھار رہیں گے، نہ یہ رنگ روغن نہ یہ چھلاسی کمر رہے گی نہ بازوؤں کا لوچ۔ برابر کی نہ لگنے لگے تو چور کا حال سو میرا۔ میں تو کہوں دس سال میں بڑی بھابی جان کی طرح ہو جائیگی۔"

"پھر ہم اپنے بیرن کے لیے ساڑھے بارہ برس کی لائیں گے۔"
نور خالہ چہکیں۔"

"ہشت!" ماموں شرما گئے۔

"دوسری بیوی نہیں جینی، اس لیے تیسری" شمسہ بیگم بولیں۔

"کیا بک رہی ہو؟"

"ہاں میاں بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں۔ دوسری تو تیسری کا صدقہ ہوتی ہے، اسی لیے پرانے زمانے میں لوگ دوسری شادی گڑیا سے کر دیا کرتے تھے تاکہ پھر جو دلہن آئے وہ تیسری ہو"

بہنوں نے سمجھایا اور ماموں سمجھ گئے۔ پھر جلد ہی رخسانہ بیگم نے بھی سمجھا دیا۔ دو تین سال میں اچھے کھانے کپڑے اور عاشقِ زار میاں نے وہ جادو پھیرا کہ پہلی کا چاند چودھویں کا ماہتاب ہو گیا، وہ چاندنی چٹکی کر دیکھنے والوں کی آنکھیں جھپک گئیں۔ پور پور سے شعاعیں پھوٹ نکلیں شجاعت ماموں پر ایسا نشہ سوار ہوا کہ بالکل ڈھت ہو گئے۔ شکر ہے جلد ہی پینشن ہونے والی تھی، ورنہ آئے دن کے دفتر سے غوطے ضرور رنگ لاتے۔

بہنوں کے لے دے کے ایک بھتیا تھے۔ بڑی ممانی تو دلہنا پے ہی میں جی سے اتر گئی تھیں۔ ان کی کمان کبھی چڑھی ہی نہیں۔ جب تک زندہ رہیں صورت کو ترستی رہیں۔ آل اولاد خدا نے دی ہی نہیں کہ ادھر جی بہل جاتا۔ میاں بہنوں کے چہیتے بھائی۔ صورت نہ دیکھیں تو کھانا نہ پچے۔ دفتر سے سیدھے کسی بہن کے یہاں پہنچتے، رات کا کھانا وہیں سے کھا کر آتے۔ پھر بھی روزانہ خوان سجائے رات تک بیٹھی راہ تکا کرتیں کسی دن اتفاق سے کھا لیتے تو ان کی زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا۔

آئے دن بہنوں کے ہاں ہنگامے رہتے۔ چھوٹوں کو کبھی بھاوج کو بھی بلا لیتیں مگر یہ بے چاری وہاں غریب الوطن سی لگتیں۔ سب نے بلانا چھوڑ دیا ـــــ شجاعت ماموں کو کبھی یار دوستوں کی دعوت کرنی ہوتی یا قوالی اور مجرے کی محفلیں جمتیں تو بیوی کو پتہ بھی نہ چلتا، بہنیں سب انتظام کر دیتیں، یہ ان ہی کے ہاتھ میں روپیہ دے دیتے۔

کسی نے ممانی کو رائے دی کہ میاں کو قابو کرنے کا بس ایک گر ہے اسے ایسے کھانے کھلاؤ کہ کسی کے گھر کا نوالہ مونہہ کو نہ لگے۔ بس جی، ممانی نے کھانا پکانے کی کتابیں منگائیں، لہسن کی کھیر اور بادام کے گلگلے، دم کا مرغ اور مچھلی کے کباب پکائے جنہیں کھا کر ماموں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ انہیں زہر دے کر مارنا چاہتی ہیں۔

ممانی خون تھوک تھوک کر مر گئیں۔

مگر نئی نویلی کا جادو تو آتے ہی سر چڑھ کر بولنے لگا۔ نہ کہیں آنے کے رہے نہ جانے کے، نہ کسی کا آنا بھائے۔ بس میاں ہیں اور بیوی۔ کیا باغ و بہار سا بھائی پٹکی بجاتے میں کھرے بان کی طرح بے رحم اور بے مروت ہو گیا! دنیا اجاڑ ہو گئی۔ اپنے پاؤں آپ کلہاڑی ماری۔ گوری بیگم سے شادی کرا دی ہوتی تو یوں بھیا صاحب الفقط نہ ہو جاتے۔

"اے بھابی بھیا کو آنچل میں کب تک باندھے رکھو گی؟ مرد ذات ہے کوئی جھنڈلا نہیں کہ ہر دم کولہے سے لگائے بیٹھی ہیں۔"

لاکھ طعنے دیے جاتے، دلہن بیگم ہیں کہ کھی کھی ہنس رہی ہیں اور میاں

کاٹھ کے اُلّو گھگھیاتے جاتے ہیں، اپنی جورو ہے کوئی پڑوسی کی نہیں کہ بس تنکے جا رہے ہیں بجر بٹو کی طرح۔

ماموں وہ ماموں ہی نہ رہے۔ اجی کیسی قوالیاں اور کیسے مجرے بس بیوی بگمنی کا ناچ نچا رہی ہے، آپ ناچ رہے ہیں۔

"اسے بس، اور تھوڑے دن کے یہ چونچلے ہیں، پیر بھاری ہوا نہیں کہ سارا اوڑھنا پاخنتم۔ ایک نہ ایک دن تو بھائی کا جی بھرے گا۔" دلوں کو تسلی دی گئی۔

اللہ اللہ کر کے رخسانہ ممانی کا پیر بھاری ہوا تو اللہ توبہ! نہ اُلٹیاں نہ طبیعت ماندی پھرے پہ اور چار چاند کھل اُٹھے، کیا مجال جو ذرا سی آلکس آجائے۔ وہی شوخیاں، نہ ہی انداز معشوقانہ جو نئی دلہنوں کے ہوا کرتے ہیں اور ماموں کا تو بس نہیں چلتا انھیں اُٹھا کر پلکوں میں چھپا لیں۔ دل نکال کے قدموں میں ڈالے دیتے ہیں۔ جی سے اُترنے کے بجائے وہ تو دماغ پر بھی چھا گئیں۔

پورے دنوں میں بھی رخسانہ ممانی کے حسن کو گہن نہ لگا۔ جسم پھیل گیا مگر چاند دمکتا رہا۔ نہ پیر پر سوجن، نہ آنکھوں کے گرد حلقے، نہ چلنے پھرنے میں کوئی تکلیف۔

جاپے کے بعد جھٹ سے کھڑی ہو گئیں۔ کیا مجال جو کمر بال برابر بھی موٹی ہوئی ہو۔ وہی کنواریوں جیسا لچکدار جسم، بھلی بیوی کے جاپے میں بال جھڑ جاتے ہیں۔ ان کے وہ اور بڑھے کہ خود سر دھونا دشوار

ہو گیا۔

ہاں بیوی کے بدلے ذرا ماموں جھٹک گئے، جیسے بچہ انہوں نے ہی پیدا کیا ہو۔ تھوڑی سی توند ڈھلک آئی۔ گالوں میں لمبی لمبی قاشیں گہری ہو گئیں، بال پہلے سے زیادہ سفید ہو گئے۔ اگر داڑھی نہ بنی ہوتی تو گالوں پر چیونٹی کے سفید سفید انڈے پھوٹ آتے۔

جب دو سال بعد بیٹی ہوئی تو ماموں کی توند اور آگے کھسک آئی آنکھوں کے نیچے کھال لٹکنے لگی۔ نچلی ڈاڑھ کا درد قابو سے باہر ہو گیا تو مجبوراً نکلوانا پڑی۔ ایک اینٹ کھسکی تو ساری عمارت کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔

ان دنوں ممانی کی عقل ڈاڑھ نکل رہی تھی۔

شجاعت ماموں کی بتیسی اصلی دانتوں سے زیادہ حسین تھی۔ عمر کا الزام نزلہ کے سر گیا۔

امتیازی پھپو کے حساب سے رخسانہ ممانی چھبیس برس کی تھیں۔ گو اب بھی وہ کبھی بچوں کے ساتھ دھما چوکڑی مچانے کے موڈ میں آ جاتیں تو سولہ برس کی لگنے لگتیں۔ کئی سال سے عمر کا بڑھنا رک گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ان کی عمر اڑیل ٹٹو کی طرح ایک جگہ جم گئی ہے اور آگے کھسکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ نندوں کے دل پر آرے چلتے۔ ویسے بھی جب اپنے ہاتھ پیر تھکنے لگیں تو نوجوانوں کی شوخیاں، مونہہ زور گھوڑے کی دولتی کی طرح کلیجے میں لگتی ہیں اور ممانی تو صاف امانت میں خیانت

کر رہی تھیں۔ شرافت اور بھل ملنساہٹ کا تو یہ تقاضا تھا کہ وہ شوہر کو اپنا خدا نے مجازی سمجھتیں اچھے برے ہیں ان کا ساتھ دیتیں۔ یہ نہیں کہ وہ نھکے مانند سے بیٹھے ہیں اور بیگم بے تحاشا مرغیوں کے پیچھے دوڑ رہی ہیں۔

"اے بھابی، تم پر خدا کی سلور، نہ سر کی خبر ہے نہ پیر کی، ہڑونگی بنی مرغیاں کھدیڑ رہی ہو!"

"اے تو کیا کروں خالہ، موئی بلی۔۔۔۔"

"اوئی، لو اور سنو اے بی بی میں تمہاری خالہ کب سے ہو گئی؟ شجن بھائی مجھ سے چار سال بڑے ہیں ماشاء اللہ ــــ بڑا بھائی باپ برابر ــــ تم بھی میری بڑی ہوئی خبردار جو تم نے پھر مجھے خالہ کہا۔"

"جی بہت اچھا۔۔۔" شادی سے پہلے رخسانہ ممانی کی اماں ان کی دوپٹہ بدل بہن کہلاتی تھیں۔

وہی حسن اور کم سنی، جس نے ایک دن شجاعت ماموں کو غلام بنا لیا تھا، اب ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ لنگڑا بچہ جب دوسرے بچوں کے ساتھ نہیں دوڑ پاتا تو چڑھ کر مچل جاتا ہے کہ تم بے ایمانی کر رہے ہو۔ ممانی اُن کے ساتھ دغا کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی تو انہیں لڑکیوں بالیوں کی طرح ہنستا یا دوڑتے بھاگتے دیکھ کر اُن کے دل میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں، وہ جل کر کوئلہ ہو جاتے۔

"لونڈوں کو لبھانے کے لیے کیا تن تن کے چلتی ہو۔" وہ زہر اُگلنے لگے

"ہاں اب کوئی جوان پٹھا ڈھونڈ لو۔"

ممانی پہلے تو ہنس کر ٹال دیتیں، پھر جھینپ کر گلنار ہو جاتیں اس پر ماموں اور بھی چراغ پا ہوتے اور بھاری بھاری الزام لگاتے۔

تب ممانی سناٹے میں رہ جاتیں۔ موٹے موٹے آنسو چھلک اٹھتے۔ الگنی سے دوپٹہ گھسیٹ کر وہ اپنا جسم ڈھک کر سر جھکائے کمرے میں چلی جاتیں۔ ماموں کا کلیجہ کٹ جاتا، ان کے پیروں تلے سے زمین کھسک جاتی وہ ان کے تلوے چومتے، ان کے قدموں میں سر پھوڑتے، ان کے آگے ناک رگڑتے، روتے لگتے۔ "میں کمینہ ہوں، حرام زادہ ہوں، جوتی لے کر جتنے چاہو مار دو۔ میری جان، میری رُخی، میری ملکہ، شہزادی!"

اور رخسانہ ممانی اپنی روپہلی باہیں ان کے گلے میں ڈال کر بھوں بھوں روتیں۔

"تمہارا عاشق زار ہوں میری جان۔ رشک و حسد سے جل جل کر خاک ہوا جاتا ہوں۔ تم تو ننھے کو گود میں لیتی ہو تو میرا خون کھولنے لگتا ہے، جی چاہتا ہے سالے کا گلا گھونٹ دوں، مجھے معاف کر دو میری جان۔" وہ جھٹ معاف کر دیتیں۔ اتنا معاف کرتیں کہ شجاعت ماموں کی آنکھوں کے حلقے اور اودے ہو جاتے اور وہ بڑی دیر تک تھکے ہوئے خچر کی طرح ہانپا کرتے۔

پھر ایسے بھی دن آ گئے کہ وہ معافی بھی نہ مانگ سکے۔ کئی کئی دن وہ روٹھے پڑے رہتے۔ بہنوں کی امیدیں بندھ جاتیں۔

"بھیا جان بھابی کو کڑھا کڑھا کے مار رہے ہیں۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ یہ آسیے دن کی دانستا رکل رنگ لائے گی!"

ممانی چھپ چھپ کر گھنٹوں روتیں۔ آنسو بھری آنکھوں میں لال لال ڈورے اور بھی ستم ڈھانے لگتے۔ تپتا ہوا زرد چہرہ جیسے سونے کی گنی میں کسی بے ایمان سنار نے چاندی کی ملاوٹ بڑھا دی ہو۔ پھیکے پھیکے ہونٹ ماتھے پر الجھی سی ایک وارفتہ لٹ۔ دیکھنے والے کلیجہ تھام کر رہ جاتے۔ حسن سوگوار کو دیکھ کر ماموں کے کندھے اور جھک جاتے، آنکھوں کی ویرانی بڑھ جاتی۔

ایک بیل ہوتی ہے ——— امربیل۔ ہرے ہرے سپنولیے جیسے ڈنٹھل ——— جڑ نہیں ہوتی ——— یہ ہرے ڈنٹھل کسی بھی سرسبز پیڑ پر ڈال دیے جائیں تو بیل اس کا رس چوس کر پھلتی پھولتی ہے، جتنی یہ بیل پھیلتی ہے اتنا ہی وہ پیڑ سوکھتا جاتا ہے۔

جوں جوں رخسانہ بیگم کے جوبن کھلتے جاتے تھے ماموں سوکھتے جاتے تھے۔ بہنیں سر جوڑ کر کھسر پھسر کرتیں۔ بھائی کی دن بدن گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر ان کا کلیجہ مونہہ کو آتا تھا۔ بالکل جھڑ کٹ ہو گئے تھے۔ گٹھیا کی شکایت تو تھی ہی، انزلا الگ عذاب جان ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا خضاب قطعی موافق نہیں۔ مجبوراً مہندی لگانے لگے۔

بے چاری رخسانہ ایک ایک سے بال سفید کرنے کے نسخے پوچھتی پھرتی تھیں۔ کسی نے کہا اگر خوش بودار تیل ڈالو تو بال جلدی سفید ہو جائیں گے۔

ڈکیہانے عطر سر میں جھونک لیا۔ ماموں کی ناک میں جو شمامت العنبر کی مدہوش کُن خوشبو کی لپٹیں پہنچیں تو وہ وہ غلیظ عیب انہوں نے ممانی پر لگائے کہ اگر بچوں کا خیال نہ ہوتا تو ممانی کنویں میں کُود جاتیں، ان کے بال سفید ہونے کی بجائے اور ملائم اور چمک دار ہو کر ڈسنے لگے۔

ممانی کی جوانی کے توڑ کے لیے ماموں نے طب یونانی کی تمام معجونیں، مقویات، کشتے اور تیل استعمال کر ڈالے۔ تھوڑے دن کے لیے ان کی بھاگتی ہوئی جوانی تھم گئی۔ بانکپن لوٹ آیا۔ ممانی نے کچھ دنیا داری کے داؤ پیچ تو سیکھے نہ تھے، خودرو پودا تھیں ــــــ کبھی کسی نے باریکیاں نہ سمجھائیں۔ اٹھائیس سال کی تھیں مگر اٹھارہ برس جیسی ناتجربہ کار اور الھڑپن تھا۔

موٹر بہت چلاؤ تو انجن جل جاتا ہے دوران کا ردِ عمل جو شروع ہوا تو شجاعت ماموں ڈھے گئے۔ ایک دم بڑھاپا ٹوٹ پڑا۔ اگر وہ جسم اور دماغ کو اتنا نہ تھکنکاتے تو باسٹھ برس میں یوں لُٹیا نہ ڈوب جاتی۔ اب وہ اپنی عمر سے زیادہ لگنے لگے۔

بیٹیں زار وقطار روتیں۔ حکیم ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ لوگوں نے ان بننے کے تو لاکھوں نسخے ایجاد کیے قبل از وقت بوڑھا ہونے کی کوئی دوا نہیں، جو ممانی کو کھلا دی جاتی۔ ضرور ان پر کوئی سدا بہار قسم کا جن یا پیر مرد عاشق تھا کہ کسی طور سے ان کی جوانی ڈھلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ تعویذ گنڈے ہار گئے، ٹونے ٹوٹکے چت ہو گئے۔

امر بیل پھیلتی رہی۔
برگد کا پیڑ سوکھتا رہا۔

تصویر ہو تو کوئی پھاڑ دے، مجسمہ ہو تو بیخ کر چکنا چور کر دے۔ اللہ کے ہاتھوں کا بنایا مٹی کا پتلا، اگر حسین بھی ہو اور زندہ بھی، اس کی ہر سانس میں جوانی کی گرمی مہک رہی ہو، تو پھر کچھ بس نہیں چلتا۔ اس کے چڑھتے ہوتے سورج کو اتارنے کی ایک ہی ترکیب ہو سکتی ہے کہ کھانے کی مار دی جائے۔ گھی، گوشت، انڈے، دودھ قطعی بند جب سے شجاعت ماموں کا ہاضمہ جواب دے گیا تھا، ممانی صرف بچوں کے لیے گوشت وغیرہ منگاتی تھیں کبھی کبھار ایک نوالہ خود چکھ لیتی تھیں، اب اس سے بھی پرہیز کر لیا۔ سب کو امید بندھ گئی کہ اب انشاء اللہ ضرور بڑھاپا تشریف لے آئے گا۔

"اے بھابی یہ کیا اچھال چھکا لونڈیوں کی طرح موئی شلوار قمیض پہنتی ہو اور بھی نھی بنی جاتی ہو۔" نند کہتیں ——— "بھاری بھر کم کپڑے پہنو کر اپنی عمر کی لگو۔"

ممانی نے ٹکا ہوا دوپٹہ اور غرارہ پہن لیا۔

"کسی یار کی بغل میں جانے کی تیاری ہے۔" ماموں نے کچوکے دیئے، ممانی کپڑوں سے بھی خوف کھانے لگیں۔

"اے بی یہ کیا ایک آدھ وقت کی نماز پڑھتی ہو، پنج وقتہ کی عادت ڈالو ———"

ممانی پنج وقتہ نماز پڑھنے لگیں۔ جب سے ماموں کی نیند بوڑھی اور

تلخ بلی ہوئی تھی، تہجد کے وقت سے جاگنا پڑتا تھا۔

"میرے مرنے کے نفل پڑھ رہی ہو"۔ ماموں بسورتے۔

دُبلی تو تھیں، دن رات کی دانتا کل کل سے اور بھی دھان پان ہوگئیں۔ گھی گوشت سے پرہیز ہوا تو رنگ اور بھی نتھر آیا، جلد ایسی شفاف ہوگئی کہ جیسے کوئی دم میں بلور کی طرح آر پار نظر آنے لگے گا۔ چہرے پر عجب نورؔ سا اُتر آیا۔ پہلے دیکھنے والوں کی رال ٹپکتی تھی، اب ان کے قدموں میں سر ٹیکنے کی تمنا جاگنے لگی۔ جب صبح سویرے نمازِ فجر سے بعد قرآن کی تلاوت کرتیں تو ان کے چہرے پر حضرت مریم کا تقدّس اور فاطمہ زہرہ کی پاکیزگی طاری ہو جاتی۔ وہ اور بھی کم سن اور کنواری سی لگنے لگتیں۔

ماموں کی قبر اور پاس کھسک آتی اور وہ انہیں مونہہ بھر بھر کے کوستے اور گالیاں دیتے کہ بھانجوں بھتیجوں کے بعد وہ جنوں اور فرشتوں کو ورغلا رہی ہیں، چلّے کھینچ کھینچ کر جن قابو میں کر لیے ہیں، ان سے جادو کی بوٹیاں منگا کر کھاتی ہیں۔

خضاب کے بعد اب مہندی بھی ماموں کو آنکھیں دکھانے لگی تھی۔ مہندی لگاتے تو چھینکیں آکر نزلہ ہو جاتا۔ ویسے بھی انہیں مہندی سے گھن آنے لگی تھی۔ رخسانہ ممانی ان کے بالوں میں مہندی لگائیں تو باوجود احتیاط کے ان کے ہاتھوں میں بھی شمعیں لَو دینے لگتیں ——— ان کے ہاتھ دیکھ کر شجاعت ماموں کو ایسا معلوم ہوتا جیسے مہندی میں نہیں ممانی نے ان کے خونِ دل میں ہاتھ ڈبو لیے ہیں۔ وہی ہاتھ جنہیں وہ کبھی چنبیلی

کی مونہہ بند کلیاں کہہ کر چوما کرتے تھے، آنکھوں سے لگاتے تھے، اب شکرے کے خوں خوار پنجوں کی طرح ان کی آنکھوں میں گھسے جاتے تھے۔ جتنا جتنا وہ ان کی منڈیا زمین پر گھستے، ممانی صندل کی طرح مہکتیں۔ بہنیں گھر سے تر مال تیار کر کے بھائی کو کھلانے لاتیں کہ کہیں بھاوج زہر نہ کھلا رہی ہو۔ اپنے ہاتھ سے سامنے کھلاتیں۔ مگر ان کھانوں سے ماموں کا حال اور پتلا ہو جاتا۔ بواسیر کی پرانی شکایت نے وہ زور پکڑا کہ رہا سہا خون بھی نچوڑ لیا۔ ابھی تک اس نامراد کشتے کا اثر باقی تھا، جو انہوں نے پچھلے جاڑوں میں مراد آباد کے ایک نامی گرامی حکیم صاحب کا نسخہ لے کر کسی سو کی لاگت سے تیار کرایا تھا۔ نسخہ بے حد شاہی قسم کا تھا۔ جسے مردہ کھا لیتا تو تنتنا کر کھڑا ہو جاتا۔ مگر ماموں گوندنی کی طرح پھوڑوں سے لد گئے۔

ڈکھیا ممانی، گھی کو سینکڑوں بار پانی سے دھوتیں۔ اس میں گندھک اور بہت سی دوائیں کوٹ چھان کر ملاتیں، دھڑیوں مرہم تھوپا جاتا۔ پتیلیوں میں نیم کے پتّوں کا پانی اوٹاتیں اور صبح شام پیپ، خون دھوتیں، ان میں سے چند پھوڑے مستقل ناسور بن گئے تھے اور ماموں کو نگل رہے تھے۔

پھر ایک دن تو اندھیرہ ہی ہو گیا۔ ماموں بہت کم زور ہو گئے تھے۔ بہنیں بیٹھی بھاوج کا ڈکھڑا رو رہی تھیں کہ نجی بڑھیا خدا جانے کہاں سے آن مری۔ پہلے تو وہ شجاعت ماموں کو نانا جان سمجھ کر ان سے فلرٹ کرنے لگی۔ کسی زمانے میں نانا جان اس پر بہت مہربان رہ چکے

تھے۔ بڑھیا نامراد کی مت ماری گئی تھی۔ نانا جان کو مرے بیس برس ہو چکے تھے۔ اور وہ اپنی چیپڑ بھری آنکھوں میں پرانے خواب جگانے پر مصر تھی، بڑی بی دسے کے بعد وہ ماموں کا اصلی مقام سمجھی تو مرحومہ ممانی کا ماتم لے بیٹھی۔

شہیے ہیئے۔ کیا بڑھاپے میں دغا دے گئیں ؟ اچانک اس کی نظر ممانی پر جا پڑی۔ ممانی صحن میں کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ عجب پیارے انداز میں وہ گردن نیوڑھائے بیٹھی تھیں، جیسے تصویر کھنچوا رہی ہوں۔ کبوتر ان کی بلوریں دمکتی ہوئی ہتھیلی کو گدگدا رہے تھے اور وہ بے اختیار ہنس رہی تھیں۔

"ہائے میں مرگئی!" بڑھیا نے اپنا چپاتی جیسا سینہ کوٹ کر رخسانہ ممانی کی طرف ہوا میں بلائیں لے کر کنپٹیوں پر دسوں انگلیاں چٹر چٹر چٹخائیں: "اللہ پاک نظر بد سے بچائے۔ بٹیا تو چاند کا ٹکڑا ہے! میں جانوں میٹھا برس لگا ہے۔ اے میاں، وہ رازداری کے انداز میں ماموں کے قریب کھسکی "یہ سوداگروں کا منجھلا بٹیا ولایت پاس کر کے آیا ہے۔ اللہ قسم بس چاند اور سورج کی جوڑی رہے گی۔

کسی زمانے میں بڑھیا بڑے معرکے کی مشاطہ تھی، اب اس کا بازار بند ہو چکا تھا۔ چونڈا سفید ہوا، ہاتھ پیر سے معذور ہوئی تو ٹکڑے مانگ کر گذر اوقات کرنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر تک تو کسی کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ بڑھیا مردار کیا بک رہی ہے۔ سوداگروں کا منجھلا بٹیا جو ولایت پاس تھا سب کی نگاہوں میں تھا۔ کسی کو شبہ بھی نہ ہوا کہ ناشدنی فطاّمہ رخسانہ ممانی کا رشتہ لگانے کی تاک میں ہے۔

"امام حسین کی قسم، میاں میں تو کنگنوں کی جوڑی لوں گی۔ بات چھیڑدوں؟"

بات جو واضح ہوئی اور پانی مرا تو بھڑوں کا چھتہ چھڑ گیا۔ چاروں طرف سے توپیں دغنے لگیں۔

"ہنستے ہنستے مجھ جنم پیٹی کو کیا خبر؟" بڑھیا سیپیر پہنتی رہتی باہر کی طرف چلتے چلتے اس نے ماموں کی پٹی ہوئی صورت پر ایک مشتبہ نظر ڈالی "مونہہ پر تو صاف کنوارپنا برس رہا ہے"۔

اس دن شجاعت ماموں نے قرآن اٹھا کر سب کے سامنے کہہ دیا کہ یہ دونوں بچے اُن کے نہیں، اڑوس پڑوس کی مہربانیوں کا پھل ہیں جن سے رخسانہ بیگم تاک جھانک کیا کرتی ہیں۔

اس رات وہ روتے رہے، کراہتے رہے، انگاروں پر لوٹتے رہے اس رات انہیں بڑی ممانی بہت یاد آئیں، ان کے بال قبل از وقت پک گئے تھے، اُن کی جوانی، اُن کا دلہناپا آنسوؤں میں بہہ گیا۔ ہیں اور پارسائی کا مجسمہ، وفا کی پتلی۔ ن کے حصے کا بڑھاپا بھی انہوں نے اپنے وجود میں سمیٹ لیا اور شریف بیویوں کی طرح جنت کو سدھاریں آج وہ ہوتیں تو یہ درد، یہ سوزش یہ سفید جڑوں والے مہندی لگے بال یہ رستے ناسور، یہ تنہائی ہٹ جاتی۔ پھر بڑھاپا رں نہ دہلاتا۔ دونوں ساتھ بوڑھے ہوتے، ایک دوسرے کے دکھ کو سمجھتے، سہارا دیتے۔

امر بیل دن دونی رات چوگنی پھیلتی گئی۔ بڑ کے پیڑ کا تنا کھوکھلا ہو گیا، ٹہنیاں ل گئیں، پتے جھڑ گئے۔ . . . بیل پاس کے دوسرے ہرے بھرے پیڑ پر رینگ گئی۔

کیسا جاں سوز سماں تھا! شجاعت ماموں کی میت صحن میں بنی سنوری رکھی ہوئی تھی، بہنیں کھڑی پڑی پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ ماموں نے اپنی ساری جائیداد بہنوں کے نام ہبہ کر دی تھی۔

رخسانہ ممانی سب سے الگ تھلگ، در سے لگی بیٹھی تھیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اتنی حسین اور سوگوار بیوہ زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ سفید کپڑوں میں وہ عجیب پُراسرار خواب لگ رہی تھیں۔ رو رو کر آنکھیں مخمور اور بوجھل ہو رہی تھیں۔ زرد چہرہ پکھراج کے نگینے کی طرح دمک رہا تھا۔ پرسے کو آنے والے سب کچھ بھول کر بس انہیں تکتے رہ جاتے۔ انہیں مرحوم کی خوش نصیبی پر رشک آ رہا تھا۔ ممانی پر بے پناہ بے بسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ خوف اور سراسیمگی سے اُن کا چہرہ اور بھی بھولا لگ رہا تھا۔ دونوں بچے ان کے پہلو سے لگے بیٹھے تھے۔ وہ ان کی بڑی بہن لگ رہی تھیں۔

وہ گم صم بیٹھی تھیں، جیسے قدرت کے سب سے مشاق فن کار نے اپنے بے مثل قلم سے کوئی شاہکار بنا کر سجا دیا ہو۔

پردے کے پیچھے سے!

"دیکھیں ـــــ دیکھیں ـــــ ذرا ہٹو تو!" زہرہ نے مجھے قریب پیچھے لٹاتے ہوئے کہا۔ اور اپنی زبردست ناک نعمت خانے جیسی باریک نالی سے چپکا دی اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ بالکل ہکا بکا۔ لیکن فوراً سنبھلی۔

"اُہو! کوئی بھی نہیں، ایسا تو کوئی حسین بھی نہیں۔ سوکھا مارا۔" زہرہ نے عینک پھڑکا کر کہا۔

"سوکھا! یہ سوکھا ہے؟ ذرا دیکھنا عذرا۔" میں نے عذرا کو اپنے اوپر لٹایا۔

"کوئی بھی نہیں! ـــــ مگر وہ ـــــ اُدھر ذرا اُدھر۔" عذرا نے بالکل دوسری طرف ہم لوگوں کی متوجہ کی۔

"کون وہ ڈاڑھی؟ ـــــ لعنت!" زہرہ ہٹ گئی۔ میں نے بھی دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

"ارے نہیں وہ ـــــ ایک ـــــ دو ـــــ تین ـــــ وہ

چوتھے نمبر پہ ہیں نازہرہ!" عذرا نے تڑپ کر کہا اور زہرہ کی گردن بالکل دائیں طرف کو مروڑ دی۔

"کیا بلتمنا؟" زہرہ بگڑ گئی۔

"ارے وہ نہیں —— وہ پچھلی لائن میں —— وہ —— دور —— ہ ——" عذرا نے بتایا۔

"اچھا وہ سا —— میں نے کل ہی دیکھا تھا۔" طفیل نوٹ بک اُلٹ کر بولیں۔ "تم نے"

"اے وہ کل تھا بھی۔ ہونہہ۔" عذرا کو بُرا لگا کہ کل وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔

"لو۔ کل تھا کیسے نہیں!" سعیدہ بھی بول ہی دیں۔

"لو اور لو۔ ہم سب جل گئے۔" یہ دونوں کل ہی سے دیکھ رہی تھیں اور ہمیں ذرا جو پتہ ہو۔ اچھا خیر۔"

زہرہ نمبر ۲ ہماری مجلس سے باہر دور کرنے سے، ناک اٹھائے ایک سفید ہاتھ کو تیزی سے قلم چلاتے دیکھ رہی تھی۔ ہم نے مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو ٹھوکے دیئے اور سوں سوں ناکیں بجانے لگے۔

"ائے —— ارے" میں نے ایک دم مجروح ہو کر کہا۔ زہرہ نمبھی اس کے ملٹری نما بوٹ سے میرا پیر کچل گیا۔

میں نے زہرہ اور عذرا کی گردنیں ایسی زور سے بائیں طرف جھکائیں کہ سکھشوئے کے تانگے کر کفر شکن جھٹکوں سے تین دن تک دکھائیں۔

"اچھا —— ہاں —— اوئی —— مگر ہنستا کیسے ہے۔" زہرہ

نے بہ غور دیکھ کر کہا۔

"ہاں ساری ڈاڑھیں تک نظر آتی ہیں۔" عذرا نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور کھلی پر سونا کیسے چمک رہا ہے۔" زہرہ نے نک سکیڑی۔

"لو وہ پھر ہنسا۔ سچ کہتی ہوں کوا تک نظر آ گیا۔" عذرا کھسکنے لگی دور۔

"ہوں —— کوا نہیں تمہیں تو اس کے پھیپھڑے نظر آنے لگے۔"
میں چڑ گئی۔

"اور وہ۔ نیلی شیروانی؟" طفیل اپنی معصوم آنکھیں گھما کر بولی۔

"کون؟ وہ بطخا!" میں نے برا مان کر کہا۔

"کوئی نہیں بطخا تو نہیں ہے وہ۔" طفیل بگڑی۔

"بطخا نہیں تو پھر کون ہے —— کیسے چیختا ہے گلا پھاڑ کے۔"
میں نے کہا۔

"واہ —— اس کی تو اس قدر خوبصورت آواز ہے۔ اتنا اچھا اسپیکر نکلے گا۔" طفیل شرمائیں۔

"اچھا۔ آ۔ آہیں آہیں آہیں۔" ہم سب نے طفیل کو گھسیٹ مارا۔

"آپ لوگ تو ظاہری شکل و صورت پہ جاتی ہیں۔" طفیل نے بی اے فلسفہ میں لیتے لیتے چھوڑ دیا تھا۔

"اور بیبٹ کے گن اس کے تم جانتی ہوں گی۔" میں نے جل کر کہا۔ اور بار بار گر جانے والے پردے کو پن سے اٹھایا۔

"آپ لوگ تو پھر گاندھی جی کو نہ جانے کیا سمجھیں گی۔" طفیل کی

نے کی۔

"بھلا گاندھی جی کو ہم کیوں "کچھ سمجھنے لگے"۔ وہ ہمارے باپ کے برابر ہیں۔

"واہ ۔" ہم سب بُرا ماننے پہ تل گئے۔

"جب گاندھی جی دیکھنے کی چیز تھے تب تو انہیں "کچھ" سمجھ بھی سکتے تھے ۔" عذرا بولیں اور مسکرائیں۔

"اور اب وہ دیکھنے کی چیز نہیں ۔" طفیل لٹھ پڑیں۔

"تم بھی دیوانی ہو —— بھئی اس وقت ان کا کیا ذکر ہے —— اور ویسے تم جو یہ پوچھو کہ وہ حسین ہیں تو ہم ہاں کہنے سے رہے —— چاہیے یہودیوں کی طرح ہندوستان سے باہر کر دیئے جائیں ۔" انصاف پسند زہرہ بولی۔

"غضب !" زہرہ نمبر ۲ بھڑک کر بولیں ہم سمجھے پروفیسر صاحب آ گئے اور جلدی جلدی قلم ڈھونڈھنے کے لیے گریباں اور جیبیں ٹٹولنے لگے۔

"وہ" زہرہ نمبر ۲ نے نہ جانے کدھر انگلی نچائی ۔" وہ —— عشرت صاحب کی بائیں مونچھ کی نوک کی سیدھ میں ——" سب نے عشرت صاحب کی مونچھ کی سیدھ لی اور غور سے دیکھا۔ پھر سب آہستہ آہستہ اپنی ناکوں کو جالی پہ ٹہلانے لگے۔ ہاں بات نئی بھی تھی، اور کام کی بھی —— ایک کھلبلی سی مچ گئی اور ہم ایک دوسرے کے بازو دبانے لگے۔

"رنگت" مجھے سانولی یا کالی رنگت ہے —— " جڑھیئے

"اوہو ـــــ رنگت سے کیا ہوتا ہے ـ" عذرا کی اور میری ایک گھڑی نہیں بنتی۔ اور یہی اس وقت ہوا ـ

"جی ہاں رنگت کا سوال کیوں نہ کریں۔ ہوتا کیوں نہیں!" میں نے اپنی دقیق بحث شروع کی ـ

"اور کیا ہوتا کیوں نہیں ـــــ گھر میں کالے کالے تمباکو کے ڈھیے بچے لڑھکتے پھریں تو بر ـــــ میں تو گلا گھونٹ دوں ـ" لفاست پسند نمبر ۲ زہرہ بولیں ـ

"تو کوئی ہم تمہاری بات لے کر جا رہے ہیں۔ اس کے لیے ـ" میں نے کاٹ کی ـ

"تم اپنی اپنی کہو۔ میں تو خیر اتنی کالی بھی نہیں ـ" زہرہ نے اپنی جلد سفید کو سرخ کر کے کہا۔ سفید جلد۔ چینی سے زیادہ جلد۔

"ششش ـــــ شی ـــــ شی ـــــ حبیب صا ـــــ کھڑ کھڑ بنچیں سرکیں اور سیاہ شیروانیاں جیسے کھونٹیوں پہ لٹک گئیں، سب کھڑے ہو گئے:

"اور قد ڈیڑھ فیٹ ـ" میں نے باہر جھانک کر خوشی سے مڑتے ہوئے کہا۔ عذرا رو دی ـ

(۲)

"لکس سوپ ـ" سعیدہ بولیں ـ

"انوسینٹ آئز" زہرہ نے چوٹ کی۔ سعیدہ شرما گئیں۔

"اور۔ وہ تو . . . . مجھے کہا ہے۔" میں نے اٹھلا کر کہا۔

"اے چلو۔ دھنیا جیسی آنکھیں۔" عذرا بڑبڑائی۔

"اوہو۔ عینک کی وجہ سے ذرا ولیسی لگتی ہیں۔ یہ دیکھو۔ میں نے عینک ہٹا کر کوے تک آنکھیں پھاڑ دیں۔

"ہاں ہوں گی بڑی۔" عذرا نے بے دیکھے بک دیا۔ "بیہودہ کہیں کی۔"

"ہاں مگر انوسینٹ تو ہرگز بھی نہیں جیسے قبر کے بجّو کی سی تو آنکھیں ہیں ———" زہرہ پر ہذیان کی سی کیفیت طاری ہوگئی ——— اور میرا جی چاہا سعیدہ کی بڑی بڑی آنکھیں کسی پھنسی پھوڑے سے ہضم ہو جائیں۔

"گلشن کہہ رہی تھیں کسی نے انہیں بتایا ہے کہ میرے ہی لیے کم بختوں نے کہا ہے۔" سعیدہ اترائی۔

"تم مر بھی جاؤ تو تمہارے لیے نہیں کہا۔ ہم مان ہی نہیں سکتے۔" میں نے کہا اور سب نے مان لیا۔

"اگر کہا بھی ہو گا تو عذرا کو کہا ہو گا۔" زہرہ نے رائے دی۔ عذرا کی زہرہ سے بڑی دوستی ہے۔

"خیر عذرا کے لیے تو کبھی نہیں کہہ سکتے ———" عذرا کے لیے کہنے میں سعیدہ کی اُتو جیسی آنکھوں کی ہتک ہوتی تھی۔ اس لیے اس کا بگڑنا حق بجانب تھا۔

"اے ہے اس چرخ سے تو میری جان جلتی ہے۔" میں نے باہر جھانک

کر موضوع بدل دیا۔ اور سب نے جھک کر ایک باریک شکل کی چڑیا جیسی مونچھوں کو گھورنا شروع کر دیا۔

"اے ہے نیل ڈال کر بال کیسے جما لیے ہیں جیسے چپاتیاں۔" زہرہ نے ناک پھڑکائی۔

"امتحان کی وجہ سے بھئی۔" طفیل تو کاش ڈاکٹری پڑھتیں۔

"امتحان کیسا۔ پٹیوں کا؟" میں نے کہا۔

"نہیں بھئی، تیل سے دماغ روشن ہوتا ہے۔" طفیل نے کہا۔ "امتحان سر پہ آ رہے ہیں۔"

"ہاں بھئی سالانہ امتحان کی تیاری ہے۔" زہرہ میرے خلاف ہو گئیں

"ہوں۔ چاہے زندگی کے امتحان میں فیل ہو جائیں۔" میں نے بڑبڑانا شروع کیا۔

"یہ کیسے؟" دیکھ لینا اوّل آئے گا۔ فیل کیوں ہو گا؟" سعیدہ کی اور طفیل کی دوستی کی انتہا ہو گئی۔

"فیل ہی ہو گا۔ بھلا ان چپکتے ہوئے بالوں کو دیکھ کر کوئی لڑکی سو میں سے دس نمبر بھی بمشکل دے گی۔" میں نے اکتا کر کتاب پر ناخونوں سے چار خانہ بنانا شروع کر دیا۔

"مگر محمود تو بھینگا ہے۔" زہرہ ہمیشہ بے کہے سنے موضوع بدل دیتی ہے یہی تو اس میں ایک عیب ہے۔

"کوئی بھینگا نہیں۔" میں نے بُرا مان کر لڑائی پر آمادگی ظاہر کی۔

"بیچ کھیت بھینگا۔" سعیدہ جلدی جلدی نوٹ نقل کرتی ہوئی بولیں۔

"لیکن اس سے تو اچھا نہیں ۔" زہرہ نمبر ۲ نے باہر جھانک کر ہمارے تازہ ترین موضوع کی طرف آنکھ ماری۔

"اب تو بس اس کی " توسائیکل کے نیچے ایک دن آکر مر جاؤ ۔" میں نے جل کر کہا۔

اور طفیل کی ضروری نوٹ بک میں سے کاغذ پھاڑ کر ناؤ بنانے لگی۔

"میں کہتی ہوں یہ نوٹ لیے جا رہے ہیں یا بر دکھوتے ہو رہے ہیں۔" عذرا نے ڈانٹا۔

"ٹر ٹر کیے جا رہی ہیں، خاک جو لیکچر سنائی دے رہا ہو۔" طفیل نے اپنا منا سا پاؤں ڈیسک پر رکھ کر لیٹتے ہوئے کہا۔

ہم نے اسی دن سوچ بچار کے بعد پرنسپل صاحب کو لکھا کہ لیکچر نہ تو ہماری سمجھ میں آئیں نہ سنائی دیں۔ ہمیں چھپے چھپائے نوٹ دیں تاکہ امتحان کے لیے رٹ لیں۔

(۳)

"اس کی تو شادی بھی ہو گئی ہے اور دو تین لڑکیاں ہیں۔" زہرہ نے ماتمی لہجہ میں کہا۔

"ارے!" اور ہم سب کے منہ اتر گئے۔

"اور اس نمبر ۶ ہم کی منگنی ہو گئی۔ آئندہ سال ولایت جا رہا ہے۔" زہرہ

نمبر ۲ پر طفیل نے گرہ جمایا۔ وہ غریب چھ روز سے ہم سے بہت دور کونے میں بیٹھ کر چپکی لوٹ لیا کرتی تھی۔ ذرا سامنہ نکل آیا بیچاری کا۔

"اور وہ۔ وہی سا۔" ہم سمجھ گئے "پرسوں اس کے گھر سے تار آیا ہے کہ لڑکا ہوا ہے۔" زہرہ نے ہنسی ضبط کر کے کہا۔

"ائے ہے لڑکا۔" ہمیں کبھی خواب میں بھی یہ سوچنے کا موقع نہ ملا تھا۔ ہم تو سمجھتے تھے خیر۔"

"وہ بھینگا۔" سعیدہ بولیں۔

"کہہ دیا کتنی دفعہ کہ وہ بھینگا نہیں۔ بھینگا نہیں۔ کل ہی میں نے ادھر سے دیکھا ہے بالکل سیدھی تارا جیسی آنکھیں ہیں۔" میں نے زخمی شیرنی کی طرح بڑبڑانا شروع کیا۔ جی ویسے ہی دکھا ہوا تھا۔

"اور وہ چتنخ۔" سعیدہ نے پھر چھیڑا۔

"اور وہ چتنخ! ہوں! یوں تو دس ڈاڑھیاں موجود ہیں۔" زہرہ کاٹنے پر تلی ہوئی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے۔" "نفیس نے بتایا۔ وہ اسے جانتے ہیں۔ کہا چلبٹی چلبٹی تین لڑکیاں ہیں اس کی۔" زہرہ بجا نے نفیس سے کیسے کیسے واہیات خبریں لا کر ہم سب کا دل دکھایا کرتی تھی۔

"رہ گیا بطخنا۔ سو وہ ہم نے طفیل کو سونپا۔" عذرا نے ٹھنڈی سانس لے کر پہلو بدلا۔

"خواہ مخواہ بطخنا، وہ سن پائے تو!" طفیل نے دھمکی دی۔

"سن کیا پائے گا۔ تم ہی سے جڑ دو گی تو سن لے گا۔ کرے گا کب؟ چارا گلی کھائے گا۔"

"اور وہ ۔ وہ جو ہے ۔ وہ کیا نام ہے ذرا گنجا سا۔" عذرا باوجود کوشش کے نام یاد نہ کر سکی۔

"اونہہ بخشو گنجے سے تو۔" میں منہ پھلا کر بنچ پر دراز ہو کر اونگھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"گنجا بڑا خوش قسمت ہوتا ہے۔" میں نے کہا ناکہ طفیل نے فلسفہ لینے کا پختہ ارادہ کر کے چھوڑ دیا تھا۔

"معاف کرو بابا۔ ہم بدقسمت ہی بھلے۔" عذرا نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا اس دن ہم میں سے کسی کا دل نہ لگا۔ نہ ہی نوٹ لیے۔ نہ لیکچر سنا۔ کیا سنتے!

(۴)

"جنے باہر سے دکھائی بھی دیتا ہے کہ نہیں۔" زہرہ نمبر ۲ نے اپنی سفید انگلیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم میں سے کئی کو دکھائی دینے کے خیال سے ہی پھریری آئی اور اپنے گھردرے خشک پیروں کو ساڑھی کے کنارے سے چھپا لینے پہ مجبور ہو گئے کہ شاید نیچے سے نظر آتے ہوں۔

"نہ جانے کیسا دکھائی دیتا ہوگا۔" زہرہ نے پھر ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

"چلو کچھ بھی نہیں دکھتا ہو گا ۔" میرا دل چاہا۔ کاش نہ دکھائی دیتا ہو۔ رنگ تو شاید نہ دکھائی دیتا ہو گا۔ میں نے اپنے رنگ سے ڈر کر کہا:

"ذرا دیکھیں ۔ ہیں ۔ جب سب چلے جائیں تو باہر جا کر وہاں سے دیکھیں دکھائی بھی دیتا ہے یا نہیں ۔" زہرہ بڑی بڑی نہ کیں بتایا کرتی ہے۔ ویسے بڑی چپکی ہے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے ۔" سب نے یقین سے کہا۔

"تم سب یہاں بیٹھنا اور میں وہاں سے دیکھ کر بتاؤں گی ۔" میں نے رائے دی۔

اور جیسے ہی کلاس ختم ہوئی اور بورڈنگ کی طرف جاتے ہوئے لڑکوں کی قطاریں آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ زہرہ طفیل کے کندھے کا سہارا لے کر کھڑکی میں لٹک گئی اور لگہ پر پیر اڑا کر اس تختے کو پھاند گئی ۔ جو پردے کے لیے کھڑکی میں لگایا گیا تھا۔ ساری کہنیوں پر کھرونچے آئے اور گرتہ الگ چھل گیا ۔ نئی وارنش سے دونوں ہاتھ چھپانے لگے ۔ میں ذرا بڑبڑاتی ہوئی اندر کود گئی ۔

"ارے ۔ رے ۔" میں نے حیرت سے منہ پھاڑ دیا ۔" افوہ ۔ سب دکھائی دے رہا ہے ۔"

سب نے تڑپ تڑپ کر ایک دوسرے کو دھکیل کر سامنے آنے کی کوشش کی۔

"ذرا ٹھیک سے بیٹھو تو دیکھوں بھی ۔" میں نے کرسی پر چڑھ کر کہا۔ اور

سب سج سج کر جیسے تصویر کھچوانے بیٹھ گئے۔

"افوہ۔ بالکل صاف۔ میں نے مبالغہ کیا اور سب مسکرائیں۔

"زہرہ تم —— تم تو بس صاف "لکس سوپ" اور —— مگر "انو سینٹ آئز" کا پتہ نہیں —— شاید —— شاید —— خیر۔" میں شرمانے کی کوشش کرنے لگی۔

اندر سے سب نے بغاوت پہ آمادگی ظاہر کی۔ شاید میری زیادتی پہ۔

"اور سنو تو۔" میں نے بلوے سے ڈر کر کہا۔" اور تمہاری ناک زہرہ نہ چپٹی لگے اور نہ اُرد کے چھلکوں کی پھلکی جیسی —— بس کتارا سی نظر آرہی ہے۔"

زہرہ نے خوشی سے عذرا کے چٹکی لی۔

"مگر تمہارے پیر سعیدہ اور چپلوں میں کتھئی موزے۔" میں رُک گئی۔

"لو میں موزے کب پہنے ہوں۔" سعیدہ نے شرما کر پیر اونچے کر لیے۔

"سنو تو۔" زہرہ کے گالوں کی سرخی دھوئے گلاب کی طرح چمکی۔" ادھر سے تو دیکھو ذرا، وہاں سے" ہم لوگ" کیسے دکھائی دیتے ہیں۔" وہ ذرا آنکھیں جھکا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی اُونچی ہو کر۔

"کوئی خاص نہیں —— ہا —— آں —— مگر تمہارا دہانہ ادھر سے ذرا پھیلا پھیلا نظر آرہا ہے۔"

میں نے گپ ماری اور جلدی سے زہرہ نے دہانہ سکیڑ لیا۔

"اور تمہاری آنکھیں تو دکھائی ہی نہیں دیتیں۔" میں نے سعیدہ کا دل

دکھایا۔

"اور نہ تمہارے بالوں کی لٹیں۔" میں نے سعیدہ کے بڑبڑانے کی پروا کرتے ہوئے طفیل کو جلایا۔

"اور وہاں سے۔ وہاں دیکھو۔" عذرا نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"کہاں سے؟ ——— بھینگے کی سیٹ پر سے۔" میں نے دوسری لائن میں آکر کہا۔

عذرا ہٹ گئی۔

"لاؤ تمہارے بیٹھنے کی سیٹ پر سے بھی دیکھوں۔" میں نے طفیل پہ چھینٹا پھینکا۔

"اور وہاں سے پروفیسر صاحب کی کرسی کے پاس ہے۔" سعیدہ نے شوق کو چھپا کر کہا۔

"اوہو۔ سعیدہ ہمیشہ اونچا ہاتھ مارتی تھی۔ ہمت تو دیکھو۔"

"یہاں سے ——— یہاں سے تم تو دکھائی نہیں دیتیں۔" میں نے جھوٹ بول کر جی ٹھنڈا کیا۔

سعیدہ نے پورا پردہ ہٹا دیا ——— مگر میں نے اسے دیکھنے سے قطعی انکار کر دیا۔

"اونہک اول تو دکھائی نہیں دیتیں ——— جو ذرا سا دکھائی بھی پڑتی ہو تو بہت کالی ——— موٹی اور بھدی۔" سعیدہ نے دوڑ کر پردہ گرا دیا۔

سعیدہ موٹی بھی کو کیا تھا۔ کمزور تو حد سے زیادہ تھی بیچاری۔ لوگ جسم دیکھتے ہیں یہ نہیں دیکھتے جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے۔

"دیکھو میں بتاؤں تم لوگ کیسے کیسے ہر وقت بیٹھا کرو۔" میں نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" سب شوق بھری آواز سے راضی ہو گئیں۔

"دیکھو ——— تم ذرا اِدھر سرکو زہرہ ——— اِدھر ——— اِدھر بھئی ———" میں نے اسے دونوں طرف سے روکا۔ اور پھر کہا۔ بھئی اُدھر نہیں اِدھر اور اُدھر نہیں اُدھر۔"

"اونہہ تو کدھر سرکوں بھئی۔" زہرہ عاجز آگئی۔ سرکتی سرکتی عاجز آگئی پر میری نظر میں نہ جچی۔

"اور تم دائیں طرف سرکو عذرا۔ ہاں اور سرکو ذرا۔"

"بھئی۔ میرے اوپر کیوں چڑھی چلی آتی ہو، ہٹو۔" زہرہ اپنی جگہ سے ہل جانے کے خوف سے لڑ پڑی۔

"ارے ——— بہن تو ذرا اِدھر ہٹو نا ———" عذرا نے زہرہ پر لد کر کہا۔

دونوں ایک ہی جگہ پر اڑ کر ایک دوسرے کو بھینچنے لگیں۔

"بھئی کیا مصیبت ہے عذرا ———" زہرہ غرائی مگر عذرا ڈٹی رہی۔

"ادھر بیں کدھر بیٹھو؟" سعیدہ نے آہستہ سے پوچھا۔ بچاری مجھ سے ڈرتی تھی۔

"اگر تم طفیل کی جگہ بیٹھو تو صاف اور اچھی دکھائی پڑو۔"

"ہٹنا ذرا بہن طفیل۔" سعیدہ نے ذرا پیار سے کہا۔

"بھئی میری کتابیں اِدھر رکھی ہیں۔" طفیل اپنی جگہ ہاتھوں سے کیوں دینی۔

اچھی اور عمدہ جگہ۔

"اے ہے ایسا بھی کیا۔۔۔۔ ذرا سرک جاؤ نا اُدھر۔" سعیدہ نے خوشامد کی۔

"کوئی اور جگہ نہیں ہے جو میرے ہی سر پہ چڑھو گی۔" طفیل چیخی اور ننھے سے جسم کو اکڑا کر۔

"اچھا تم زہرہ نمبر ۲ کے دائیں ہاتھ پر آجاؤ۔" میں نے دونوں دوستوں کی لڑائی سے ڈر کر کہا۔

زہرہ نمبر ۲ جھٹ پھدک کر اپنے ہی دائیں ہاتھ پر آن بیٹھی۔

"لو۔" سعیدہ نے مردہ آواز میں کہا۔ "بھئی کہہ دیا ہم لوگوں میں ذرا بھی وہ نہیں۔"

"تو تم عذرا کی جگہ آجاؤ۔" میں نے رائے دی۔

"بھئی۔ میں کیوں اپنی جگہ سے ہٹوں واہ۔" عذرا بھویں چڑھا کر مسکرائی۔

"اچھا ـــــ تم وہاں سیڑھیوں کی طرف روشنی میں بیٹھو ـ" میں نے کہا۔

سب رشک سے دیکھتے ہی رہ گئے ـــــ اور سعیدہ عین روشنی میں اپنا مسکراتا ہوا چہرہ جالی سے لگا کر انتظار میں بیٹھ گئی کہ میں اب بولوں اور اب بولوں۔

میں نے دو ایک دفعہ اِدھر اُدھر جھک کر دیکھا اور منہ بنایا۔

"میں اب بھی صاف دکھائی نہیں دیتی ـــ؟" سعیدہ نے اُمید بھری آواز سے پوچھا۔

"نہیں" میں نے جیسے ذلیل ہو کر کہا۔ اور اس کی مسکراہٹ کس قدر اُداس ہو گئی۔

میں نے اسے دیکھ کر ہی نہ دیا۔

چاپ ـــــ چاپ ـــــ چ ـــــ چم ـــــ چمہ ـــــ اور قہقہہ ـــــ!

لڑکے دوسری میٹنگ سے واپس آرہے تھے رسعیدہ کا بُرا صبر پڑا ـــــ میں پر کٹی چڑیا کی طرح پنجوں پر چھلانگیں مارنے لگی رکرسی اور اس کے اوپر ایک اور کرسی ۔کھڑکی میں آئی ـــــ ساڑھی چٹخنی میں پھنس گئی اور یہ بڑا کھونٹا صدری میں لگا ـــــ مگر میں کُود پڑی ـــــ چوڑیاں ٹوٹ کر اندر ہی رہ گئیں اور چوڑا میری کلائی میں پیوست ہو گیا۔ وہ تو کہو عینک بچ گئی۔

"دھڑ ـــــ دھڑ ـــــ دھڑڑ ـــــ" کوئی باہر دروازے کو کوٹ رہا تھا۔

"ارے! باوجود اس سیاہی کے اس وقت میں سفید پڑ گئی۔ میں اندر سے دروازہ بند کر آئی تھی۔

سنا ہے دوسرے دن لڑکوں پہ ڈانٹ پڑی کہ کیوں سیڑھیوں پہ چڑھ کر لڑکیوں کو جھانکتے ہیں بچارے بچے کچھ نہ بولے۔

آج گاندھی جینتی ہے۔ شہر میں کتنی چہل پہل ہے۔ پھولوں اور رنگ برنگے جھنڈوں سے آراستہ پیراستہ موٹریں اپنی آغوش میں توندیلے سیٹھوں کو دبائے فراٹے بھر رہی ہیں۔ برف جیسی سفید کھدر میں یہ آبنوس پتلے کالے سفید کا چکر املاپ آنکھوں پر کیسی تکلیف دہ چوٹ کرتا ہے اور ان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی بدذوق سیٹھانیاں اودھم مچاتے ہوئے بچے "سونے پر سہاگہ" کا کام کر رہے ہیں۔ دولت بنا کہے سنے ان پر ٹوٹ پڑی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کپڑے پہنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ بہت سے بے ہنگم تھان کسی نے الجھا کر موٹروں میں ٹھونس دیے ہیں۔ سامان آرائش، رنگ و پوڈر الماریوں سے کود کر آن پر آن پڑا ہے۔ ناک بہتے تیل میں چپچپاتے بچے وائٹ اوے کی الٹرا موڈرن فراکوں کے ساتھ جب جھانجھن کپڑے پہنے ...

... آنکھوں میں منوں کاجل آنڈیلے عجیب مضحکہ خیز ہیولیٰ بنے ہوئے ہیں۔

آج اہنسا وادی ان کی یاد میں آتما کو شدھ کرنے کے لیے سوت کات رہے ہیں۔ بڑے بڑے منسٹر، چوٹی کے افسر، ملوں کے مالک سٹے اور چور بازاروں کے بیوپاری، ایک محاذ پر اکٹھے ہو کر آتما کو شدھ کر رہے ہیں۔ دو سال کے عرصے میں کتنی بہت سی آتمائیں ناپاک ہو چکی ہیں۔ ان کے لیے اس سوت کے تانے بانے سے ایک سائبان بنا جائے گا جس کی چھاؤں میں نچنت بیٹھ کر یہ پھلتے پھولتے رہیں گے۔

میرے ماموں جان بھی اپنے ڈرائنگ روم میں صوفہ پر نیم دراز صبح سے تکلی نچا رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر کیسا مقدس عزم چھایا ہوا ہے۔ جانو پل صراط بن رہے ہیں جس پر چل کر انہیں سورگ میں جانا ہے۔ نہ جانے وہ اس کچے سوت کے پھندے سے کیا کچھ پھانس لینے کی تگ و دو لگا رہے ہیں۔

کبھی وہ برٹش سرکار کے فرزندِ دلبند رہ چکے تھے، لیکن چیونٹی کی طرح طوفان کی خبر پاکر جلدی سے نمک کی بسینہ گرہ میں گود پڑے اور نمک بنانے لگے۔ جب وہ یوں "گمراہ" ہوئے تو ان کے والد صاحب نے انہیں عاق نہیں کیا بلکہ بیٹے کی دانشوری کی داد دی۔ وہ خود سرکار سے وابستہ رہے مگر ان کا بیٹا باغی ہو گیا۔ جبھی تو آج وہ دیسی سرکار کی ناک کا بال بنے ہوتے ہیں۔ بیس سال محکمۂ تعلیم کی اصلاح کرنے کے بعد وہ اب کمیونسٹوں کو ملیامیٹ کرنے والی اسکیم میں بڑی شد و مد سے حصہ لینے کے قابل ہو گئے ہیں۔

تکلی نچانے جانتے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ بھنگیوں کی ہڑتال طالب علموں کی مدد سے نہ ٹوٹ سکی۔ یہ وار خالی ہو گیا۔ اب طالب علموں کی ہڑتالیں کس

ہاتھوں میں ترنگے جھنڈے ہیں اور امریکن کھلونے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی سستے سرکس کا اشتہار چلا جا رہا ہے۔

آج باپو کا جنم دن ہے نا۔ آج بھارت کے سپوت نے بھارت واسیوں کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے دھرتی پر پہلا سانس لیا تھا۔ مگر پرتیل امدلا آل باغ کی چالوں میں یہ کیسی مردنی چھائی ہوئی ہے جیسے آج ان کا کوئی پیدا ہوا ہو، بلکہ ہزاروں موتیں ہوگئی ہوں۔ لاکھوں امیدیں دھواں بن گئی ہوں۔ ان کے چہروں کی رونق کہاں غائب ہوگئی ہے کیا یہ کبھی واپس نہ آئے گی؟ ان کے کپڑوں میں رنگ کیوں نہیں طلعے کی چمک کیوں نہیں ان کے ہاتھوں میں ترنگے غبارے کیوں نہیں؟

باپو تو جنتا کے تھے۔ پھر یہ چور بازاریوں ہی کے ہتھے کیوں چڑھ گئے جیسے پرانے زمانے کے دیوتاؤں کو چھین لیا تھا، ایسے ہی انہیں بھی لوگ اٹھالے گئے اور شوکیس میں سجا دیا۔ تجوریوں پر منڈھ دیا۔ . . . لین دین کی ترازو کے پلڑے میں ٹھیکری بنا کر ڈال دیا ہے۔ انہیں مٹھائی اور بسکٹ کے ڈبوں پر چپکا دیا ہے بوٹوں کے اشتہار پر ٹانگ دیا ہے۔ ان کا نام لے کر چندے جمع کرتے ہیں۔ ان کا نام لے کر ہڑتالیں توڑتے ہیں۔ انہیں کا بہانہ کر کے کنٹرول ہٹاتے ہیں اور کالے بازار کو سینچتے ہیں ان کے بنا کوئی دھندہ نہیں چلتا۔ جانو ترپ کا اکا ہاتھ آگیا ہے، ہر داؤ پر وہی لگا دیتے ہیں۔ اب شاید انہیں کے نام پر اہنسا کے اصولوں پر تیسری جنگ کا خون چھڑکا جائے گا۔

کی مدد سے تڑوائی جائیں: تالی بجنے کے لیے دو ہاتھوں کا ہونا ضروری ہے سر لڑانے کے لیے دو سروں کا ہونا ضروری ہے۔ کیا طالب علموں کے دو ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے؟ ماموں جان زہر کا توڑ زہر ہی کرتے ہیں۔ اس لیے طالب علموں کی ایک صحیح نمائندہ جماعت کی پیداوار میں منہمک ہیں جو جی توڑ کر قومی گیت گانے فیس بڑھانے پر سرکار کی بے پناہ مہربانی کا شکریہ ادا کرے اور کمیونسٹوں کے بہکاوے میں آکر ملک کا تختہ نہ اُلٹے بس پھر ہڑتالیں بند ہو جائیں گی۔ ادھر نکلی ناچ رہی ہے۔ ادھر وزیر اعظم پردیسیوں سے ناطہ جوڑ آئے ہیں، وہاں سے تحفہ لائیں گے جس کی مدد سے بھوک کے ساتھ ساتھ بھوکوں کا بھی صفایا ہو جائے گا۔

ادھر میرے نانا جان انہیں رشک آمیز نظروں سے تک رہے ہیں۔ وہ صبح سے بیٹھے جوجھ رہے ہیں پر تکلی ان کے تکلے سے بل نکالے دے رہی ہے۔ روئی کا ٹکڑا اپسینہ میں ڈوب کر چوہے کی شکل کا ہو گیا ہے۔ تین تکلیاں بدل چکے ہیں پر ہر نئی تکلی انہیں نیا ناچ نچا رہی ہے۔ وہ اکڑوں بھی بیٹھے پالتی بھی ماری دو زانوں ہوئے پھر ماموں جان کی طرح نیم دراز بھی ہو گئے مگر ان کی طرح سرت بھاڈ نہ جا سکے۔ کوئی تکلی بھی ماموں جان کی تکلی والا ابھرا لٹا نہیں بھر پائی۔

وہ جھنجھلاتے ہیں تب ماموں جان مسکراتے ہیں۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہوں: "قبلہ ریاض کی ضرورت ہے ریاض کی۔ یہ مرتبہ یوں بلا تپسیا کیے ہاتھ نہیں لگ جایا کرتا۔ جہاد کے لیے تلوار پکڑنے

کی آرزو مند انگلیاں بھلا تکلی کو پکڑنا کیا جانیں۔ آپ توپ تفنگ کے عادی ٹھہرے۔ یہ روحانی تلوار یعنی تکلی گھمانا کیا جانیں۔

میرے نانا جان ان کی آنکھوں کی بات چیت سمجھنے کے ایسے عادی ہو چکے ہیں کہ فوراً ان کے گھٹنے لرزنے لگتے ہیں، ویسے ہی ان کی گھبراہٹیں مالیخولیا کی حدوں کو چھو رہی ہیں، جب سے سنا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ ان کی تجارت کھنڈت میں پڑنے والی ہے بالکل ہی حواس باختہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا ایک پیر ہندوستان میں ہے تو دوسرا پاکستان میں؛ یہاں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا واسطہ دیتے ہیں تو وہاں اسلام کی دہائی۔ پر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ نانا جان کی چیخ و پکار میں کوئی دم نہیں رہا۔ دونوں ملک ایک دوسرے سے دور کھسکتے جا رہے ہیں اور ان کے ساتھ میرے نانا جان کے دونوں پیروں کے درمیان کا فاصلہ خطرناک حد تک دور ہوتا جا رہا ہے۔ بیچ میں سے چر جانے کا کرب ان کی رگ رگ میں رچ گیا ہے۔ دکھ اور خوف سے پتھرائی ہوئی آنکھیں وہ گاندھی جی کے اس مجسمے کی طرف پھیر دیتے ہیں جو بنگلہ کے بیچوں بیچ نصب ہے اور ہر آنے جانے والے کو جتا کر نانا جان وہاں روز پھول چڑھا کر ڈنڈوت کرتے ہیں۔

ماموں جان پر انھیں وہ شک نہیں آتا۔ اب تو جادوگری کا بھی شبہ ہونے لگا ہے۔ وہ کیسی دلیری سے بیٹھ کر افسروں کے بیچ میں وزیراعظم پر چھینٹے بازی شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے لوکھلانے اور ایک دم پھرنے کے قصے سنا سنا کر کیا مزے سے قہقہے لگاتے ہیں اور لگواتے ہیں۔ کانگریس مہادیوں کا

وہ بالکل گھر کی بڑی بوڑھیوں کی طرح ذکر کرتے ہیں۔

تو بالکل گدھا ہے، ایک مہادیوی نے ایک بار میرے ماموں جان سے کہا تھا اور اس وقت انہیں اپنی خوش نصیبی پر فخر ہوا تھا اور آنکھوں میں مارے عقیدت کے آنسو اُبل آئے تھے۔ اب بھی بعض موقعوں پر جب وہ قصہ سناتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو اُبل آتے ہیں۔ نانا جان اس روحانی رشتے کی متبرک لطافت پر جھوم جھوم اُٹھتے ہیں، پر دکھ سے تلملا جاتے ہیں۔ کاش انہیں بھی کسی نے پیار سے گدھا یا کُتا کہا ہوتا تو وہ آج کتنی بہت سی زحمتوں سے بچ گئے ہوتے۔ مگر ایک بار قائداعظم کے جلوس کا اونٹ بننے کے بعد کسی اور اصطبل میں تو ان کے لیے جگہ ہی نہیں اور راج باپو کی جینتی کے موقع پر تکلی کے نخرے بڑے کھل رہے ہیں۔

وہ سوت کاتتے جا رہے ہیں اور اس میں موٹی موٹی گالیاں پروتے جا رہے ہیں، مگر وہ جانتے ہیں یہ اڑیل سوت ان سے شرط باندھ کر مقابلہ کر رہا ہے۔ مروڑیاں دیتے دیتے ان کی چٹکیاں تھک چکی ہیں۔ پورے سہلا رہے ہیں۔ پر سوت مجال ہے جو کمبخت دو اِنچ سے آگے کھسک جائے جبھی تو وہ اس میں مغلظات کی گرہیں جڑتے جاتے ہیں۔ یہ سوت وہ عیدالضحٰی کے موقع پر وزیر اعظم کی گردن میں مالا بنا کر حمائل کرنا چاہتے ہیں۔ بڑی کاوشوں سے انہوں نے مسلمان محلوں میں لوگوں کو اونچ نیچ دکھا کر وزیر صاحب کو مدعو کرنے کا انتظام کیا ہے۔

جب کبھی تار ٹوٹتا ہے تو ان کا جی چاہتا ہے کہ ایک دم حج کو چلے جائیں

اور وہاں درِ حضورؐ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے ایک مستقل مراقبہ میں چلے جائیں! مگر ایک دم انہیں ہندوستان اور پاکستان میں پھیلے ہوئے کاروبار کا خیال اس مراقبہ سے چونکا دیتا ہے اور وہ سہم کر چاروں طرف دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں ماموں جان کا چھٹا ساتواں احساس ان کے دل کا چور نہ پکڑ لے۔ نہیں تو سارے کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔

اپنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے روڑی مل جی کی نکلی بھی کچھ نال سُر سے نہیں ناچ رہی ہے۔ چکریاں لیتے لیتے ایک دم سے توڑے لینے لگتی ہے اور پھر تیور اکر تار بھی توڑ دیتی ہے مگر روڑی مل جی ہمت نہیں ہارتے۔ ملک میں بڑی افرا تفری پڑی ہے۔ جدھر دیکھو بے ایمانی، دھوکہ بازی، باپو کی تعلیم کو بھول کر سب لوٹ کھسوٹ پر تلے ہوئے ہیں۔ ایسے میں کوئی ایمانداری کا بیوپار کرے تو کیسے کرے۔ ایمانداری چلے گی کتنے دن کھلے بازار میں دھرا ہی کیا ہے؟ مال کو بازار نہیں ملتا، بازار کو گاہک نہیں ملتے۔ جب مال کوٹھیوں میں پڑا اسٹر رہا ہے تو مزدور کو کوئی مزدوری کہاں سے دے۔ نیتا کہتے ہیں کہ مال کی پیداوار بڑھاؤ، سو بڑھ گئی، اب نیتا یہ نہیں بتاتے کہ گاہکوں کی پیداوار کیسے بڑھائیں؟ کاش "خوراک اگاؤ" کا نعرہ مارنے کے بجائے خریدار اگاؤ" کی اسکیم چلا سکتے۔ مگر خریدار کا بیج سوائے امریکہ کے کہیں نہیں پیدا ہوتا۔ امریکہ نے تو کیا مزے سے سارے ملکوں میں لدا لد بو کر خریداروں کے کھلیان قائم کر دیے ہیں۔

یہاں سب باتوں کی ذمہ دار آتما کی گندگی ہی تو ہے۔ جدھر ہی تو بھارت

کا ایٹم بم ہے۔ سوت کات کات کر انگریزوں کا اَنتر کر دیا تو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کیا حقیقت ہے۔ جب آتما شدھ ہو جائے گی پھر یہی سوت کا جال سمندر سے مچھلیوں کی طرح اَن گنت گاہک پکڑ لائے گا۔ یہی کچے دھاگے اس دیو کا بھی بند بند جکڑ ڈالیں گے جو کروٹ بدل کر چونک رہا ہے۔ سب دکھ دور ہو جائیں گے۔

زنان خانہ میں ممانی بھی بلبلاتی تکلی کو منہ کر اپنے جیون کا امرت نچوڑتے پر جٹی ہوئی ہیں۔ باوجود کوششوں کے وہ کھدر نہ پہن سکیں۔ ان کا اطلس اور کمخواب کی آغوش میں پلنے والا جسم کھدر کے گھستے نہ سہار سکا اور ہمیشہ پھید اُٹھتا۔ گرمی دانے پھنسیاں اور پھر پھوڑے بن جاتے۔ یہ دائی کے پہاڑ ویش سیو کو مرہم کا چپچپا ہوا پھایا بنا دیتے۔ کچھ دن تک تو ماموں جان نے ان کے جسم کے زمینداری ٹھسوں کو نہ گردانا، مگر جب ڈاکٹروں نے مریضہ کو سوائے باریک ململ کے دوا میں ڈوبے ہوئے پھایوں کے جملہ سنز پوشی ہی سے منع کر دیا تو وہ مجبوراً اس شدھی سے باز آ گئے ویسے بھی ٹنکچر اور آئڈو فارم کے حملے جھیلنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس کے وہ انہیں تیسرے درجے کا نیشنلسٹ سمجھنے لگے اور ایسے حقارت سے دیکھتے تھے جیسے ایک پہنچا ہوا پیر مرشد کسی مبتدی کو دیکھتا ہے۔

ممانی بھی تکلی گھما رہی ہیں مگر ان کی انگلیاں لرز رہی ہیں۔ ان نازک تاروں تاروں میں ان کے جذبات کی ہلچل کو سہارنے کی سکت نہیں، کیونکہ اس مزاج کی انگلیاں بھی تو قابو میں نہیں۔ ماموں جان کے گھر کے سارے ساز و سامان

کی طرح آج ان کی پرائیویٹ سیکرٹری بھی شدہ ہونے کا پختہ ارادہ کر کے ماموں جان سے تکلی چلانا سیکھ رہی ہے۔

مس دراج کی عمر کا ابتدائی حصہ یتیم خانہ میں گذرا جہاں وہ یسوع مسیح کے مجسّمے کے سامنے خدا کی برکات کی حمد گاتی رہی۔ کھردرے بدرنگ کپڑے پہن کر اور ناقص کھانے کھا کر اس نے خدا کی عنایات کی داد دی۔ یتیم خانے سے نکل کر وہ سیدھی فوج کے دفتر پہنچ گئی۔ جنگ کے یہ چند پُر بہار سال اس کی زندگی میں روشن ستاروں کی طرح ہمیشہ درخشاں رہیں گے۔ وہ سیر سپاٹے، وہ رقص و سرود کے جگمگاتے سفید چمڑی والے عاشقوں کے نرغے۔ جوان لڑکیوں کی کمی جس نے کواریوں کو بھی پاپڑ بنا دیا تھا اور وہ ایک خستہ پاپڑ کی طرح ایک جبڑے سے دوسرے جبڑے میں منتقل ہوتی گئی۔ انگریز سارجنٹ کے ہاتھ سے جب زیادہ الاؤنس پانے والے امریکن سارجنٹ نے اسے جیت لیا تو وہ گھنٹوں آئینے میں اپنی چوڑی ناک میں حسن تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

پھر ایک دم جیسے اسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ جنگ ختم ہوگئی۔ گورے سورما ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے اور وہ ایک لٹو کی طرح ان کے گرد وہیں بھناتے سے ایک سے دوسری بانہہ میں منتقل ہوتی گئی یہاں تک کہ اس کے بازو خالی فضا میں پھڑپھڑاتے رہ گئے۔ اس کے ساتھ والیوں نے جنگ کے بازو میں کتنا کچھ جمع کر لیا۔ یہ سفید سپاہی بڑے دل پھینک اور ساتھ ساتھ دولت پھینک بھی ہوتے ہیں۔ جاتے وقت وہ اپنی محبوباؤں

کون؟ خود بھائی اور دوچار سڑے مرائے ذرا ذرا سے ان کے دوست۔ مگر نہیں، وہ تو عورت ذات کو سات تالوں میں رکھنے کی قائل اور یہاں بیگم جان کی وہ دہشت کہ دنیا بھر کے غنڈوں سے نہیں۔ بس چلتا، تو اس وقت سڑک پر بھاگ جاتی، پھر وہاں نہ ٹکتی۔ مگر لاچار تھی۔ مجبوراً کلیجہ پر پتھر رکھے بیٹھی رہی۔

کپڑے بدل سولہ سنگھار ہوئے۔ اور گرم گرم خوشبوؤں کے عطر نے اور بھی انہیں انگارا بنا دیا، اور وہ چلیں مجھ پر لاڈ اتارنے۔

"گھر جاؤں گی ۔۔۔" میں نے ان کی ہر رائے کے جواب میں کہا، اور رونے لگی۔

"میرے پاس تو آؤ میں ۔۔۔ تمہیں بازار لے چلوں گی ۔۔۔ سنو تو ۔۔۔"

مگر میں کھلی کی طرح پھیل گئی۔ سارے کھلونے، مٹھائیاں ایک طرف اور گھر جانے کی رٹ ایک طرف۔

"وہاں بھیا ماریں گے ۔۔۔ چڑیل ۔۔۔" انہوں نے پیار سے مجھے تھپڑ لگایا۔

"پڑے ماریں بھیا ۔۔۔" میں نے دل میں سوچا، اور روٹھی اکڑی بیٹھی رہی۔

"کچی امیاں کھٹی ہوتی ہیں بیگم جان ۔۔۔" جلی کٹی رَبّو نے رائے دی۔ اور پھر اس کے بعد بیگم جان کو دورہ پڑ گیا۔ سونے کا ہار جو وہ تھوڑی دیر پہلے مجھے پہنا رہی تھیں، ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مہین جالی کا دوپٹہ تار تار۔ اور وہ مانگ جو میں نے کبھی بگڑی نہ دیکھی تھی، جھاڑ جھنکاڑ ہو گئی۔

"اوہ ۔۔۔ اوہ اوہ اوہ ۔۔۔" وہ جھٹکے لیکر چلانے لگیں، میں رپٹی باہر۔

بڑے جتنوں سے بیگم جان کو ہوش آیا۔ جب میں سونے کے لئے کمرے میں دبے پیر جاکر جھانکی، تو رَبّو ان کی کمر سے لگی جسم دبا رہی تھی۔

"جوتی اتار دو ۔۔۔" اس نے اس کی پسلیاں کھجاتے ہوئے کہا۔ اور میں چوہیا کی طرح لحاف میں دبک گئی۔

ہیں۔ جیسے کسی کا گلا گھونٹ رہی ہیں، مگر دوسرے لمحے اہنسا کے سائے میں پلی ہوئی شیرنی دبک کر سوٹ جوڑ لیتی ہے اور ایک موہوم سہارے پر آگے چل پڑتی ہے۔ وہ اپنی ساری بدنصیبی کو اولاد نہ ہونے پر محمول کرتی ہیں۔ اگر آج ان کی گود میں ان چھ لڑکیوں کے بجائے ایک گھی کا لڈو دہمکتا ہوتا تو میاں کی مجال نہ تھی کہ ان کے سینے پر یوں دمامی سوتیں چڑھا لاتے۔ مگر لڑکے کا بیج سدا بیکار گیا۔ خواہ ایک ماہ کا بھی ہوتا وہ اسے بیٹیوں ہی کی صف میں کھڑا کر کے ماتم کرتیں۔ وہ ایک مرد کے ہاتھ کے میل پر پلی تھیں۔ اب بھی ایک شریف مرد ہی ان کا کفیل ہے۔ پھر جب یہ مرد مروڑا دے دے دیتا ہے تو انہیں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ اگر وہ خود ایک سہارا بن سکتیں تو پھر بڑھاپا نیر ہو جاتا مگر ماموں جان کہتے ہیں یہ بھی ان کا خاندانی قصور ہے۔ عموماً نوابوں، جاگیرداروں کے یہاں اولادِ نرینہ ناپید ہوتی ہے اور اس کا بھگتان وہ بھی بھگت رہے ہیں، وہ خود ان کے جسم میں تو نرینہ بنانے کا کافی مادہ ہے۔

کون جانے جس تکلی نے سوراج دیا کیا وہ انہیں ایک بیٹا نہیں دے سکتی۔ ایک دم اماں کے چہرے کے کھنڈر جاگ اٹھتے ہیں۔ ڈراونی مسکراہٹ ایک نئی کروٹ بدل کر انگڑائی لیتی ہے۔ تکلی ناچ رہی ہے اور وہ مسکرا رہی ہیں۔ اس کچے دھاگے کو وہ اکلوتے بیٹے کی طرح پروان چڑھتے دیکھ رہی ہیں.....

ایک سوت..... پھر دوسرا..... تیسرا اور چوتھا۔ سارے

مل کر ایک مضبوط رسی بن جائے گی۔ مس راج کے گلے کو گھونٹتی چلی جائے گی جس نے ان کا جیون امرت چرا لیا ہے۔

یوں آج باپو کی جینتی کے روز آتمائیں شدھ ہو رہی ہیں۔ گندی اور گھناؤنی آتمائیں۔

مگر لال باغ اور پریل کے علاقوں میں ایک بھی تکلی ناچتی نظر نہیں آتی کسی کو آتما کو پاک کرنے کی فکر نہیں۔ اس چھین جھپٹ اس منافع خوری اور اشتہار بازی کے چوراہے پر دور کامگار میدان میں بمبئی کے محنت کش "امن کانفرنس کے پہلے اجلاس کے موقع پر زندگی کے نئے پروگرام بنا رہے ہیں۔ یہاں باشعور محنت کش طبقہ کی رہنمائی میں چھٹنی کی دھار سے زخمی مزدور، فیسوں کے بارے کچلے ہوئے طالب علم اور کم تنخواہ اور مہنگائی کے مارے کلرک اور معلم تیسری جنگ کے خلاف امن کا عزم لے کر جمع ہوتے ہیں۔ پچیس ہزار جانیں ایک قالب ہو کر امید بھری نظروں سے آزاد ملکوں کے رہنماؤں کی تصویروں کو تک رہی ہیں۔ اپنے دلوں کی آواز اپنے ساتھیوں کے منہ سے سن رہی ہیں۔

"تیسری جنگ نہ ہوگی۔۔۔۔ انسان انسان سے نہیں، اس بار حیوان سے لڑے گا۔۔۔۔۔۔۔ کالے بازار سے جنگ کرے گا۔ ڈالر کے غلاموں کا مقابلہ کرے گا۔"

کون کہتا ہے یہ نہتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے خوفناک ہتھیار

ہیں۔ جن کے تخیل ہی سے سلطنتیں لرز رہی ہیں۔ ایٹم بم کانپ رہے ہیں اور ڈالر کے پل ٹوٹ رہے ہیں۔ یہ نظر نہ آنے والے پچیس ہزار فولادی تاروں کی ایسی رسی بٹ رہے ہیں جو ساری فاشسٹ قوتوں کا گلا گھونٹ ڈالے گی۔

جبھی تو کامگار میدان کے چاروں طرف پولیس کا مسلح پہرہ ہے۔ سی آئی۔ ڈی کا چکر ہے۔ زرخرید ٹونڈے منڈلا رہے ہیں۔

ناجائز شراب پر پہرہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کالے بازار پر پہرہ نہیں ۔ ۔ ۔ چوراچکوں پر پہرہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رشوت ستانی اور عصمت فروشی پر پہرہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا بھر کی غلاظتیں پھل پھول رہی ہیں ۔ ۔ ۔ مگر امن چاہنے والوں پر پہرہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موت بے لگام طرارے بھر رہی ہے اور زندگی کے لبوں پر تالہ ہے۔ سڑتے ہوئے گناہ کے سر پر قانون کی چھاؤں ہے۔ شاداب انسانیت کے سر پہ شیطانی آگ ۔ ۔ ۔ ۔

آج میں اس مجمع کے درمیان میں کہاں کھو گئی ہوں۔ پچیس ہزار دلوں کی دھڑکن میرے دل کی دھڑکن کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو چکی ہے کہ ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ پچاس ہزار آنکھوں میں میری آنکھیں کون سی ہیں؟ میری انفرادیت کہاں ہے؟ میرا شعور، لاشعور، میری جبلت، میری الجھنیں پریشانیاں اور میرے ذاتی درد کہاں ہیں؟

مگر اپنی وسعت پر خود حیران ہوں۔ ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے:
میری انفرادیت کا مگار میدان میں کھچا کھچ بھری ہے۔ یہ پچیس ہزار دل اور
پچاس ہزار آنکھیں میری ہی ہیں۔ ذرا اور اوپر آنکھ اُٹھاؤں تو پچیس لاکھ پچیس
کروڑ۔۔۔نہیں مجھے گنتی معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔اس طوفان میں
میں بھی ایک قطرہ ہوں۔۔۔اور ہر قطرہ طوفان ہے۔

چٹان

بھابی بیاہ کر آئی تھی تو مشکل سے پندرہ برس کی ہو گی۔ بڑھوار بھی تو پوری نہیں ہوئی تھی۔ بھیا کی صورت سے ایسی لرزتی تھی جیسے قصائی سے گائے مگر سال بھر کے اندر ہی وہ تو جیسے منہ بند کلی سے کھل کر پھول بن گئی جسم بھر گیا۔ بال گھمیرے ہو گئے۔ آنکھوں میں ہرنوں جیسی وحشت دور ہو کر غرور اور شرارت بھر گئی۔

بھابی ذرا آزاد قسم کے خاندان سے تھی، کانونیٹ میں تعلیم پائی تھی۔ پچھلے سال اس کی بڑی بہن ایک عیسائی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس لیے اس کے ماں باپ نے ڈر کے مارے جلدی سے اسے کانونیٹ سے اٹھایا اور چٹ پٹ شادی کر دی۔

بھابی آزاد فضا میں پلی تھی۔ ہرنوں کی طرح قلانچیں بھرنے کی عادی تھی مگر سسرال اور میکہ دونوں طرف سے اس پر کڑی نگرانی تھی اور بھیا کی بھی یہی کوشش

تھی کہ اگر جلدی سے اُسے پکّی گھرہستن نہ بنا دیا گیا تو وہ بھی اپنی بڑی بہن کی طرح کوئی گل کھلائے گی۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھی۔ لہٰذا اُسے گھرہستن بنانے پر جٹ گئے۔

چار پانچ سال کے اندر بھابی کو گھِس گھسلکے واقعی سب سے گھرہستن بنا دیا۔ وہ تین بچوں کی ماں بن کر بھدی اور بھٹس ہو گئی۔ اماں اسے خوب مُرغی کا شوربا گوند سٹور سے کھلاتیں۔ بھیّا ٹانک پلاتے اور ہر بچے کے بعد وہ دس پندرہ پونڈ بڑھ جاتی۔

آہستہ آہستہ اُس نے بننا سنورنا چھوڑ ہی دیا تھا۔ بھیّا کو لپ اسٹک سے نفرت تھی۔ آنکھوں میں منوں کاجل اور مسکارا دیکھ کر وہ چڑ جاتے۔ بھیّا کو بس گلابی رنگ پسند تھا یا پھر سُرخ ——— بھابھی زیادہ تر گلابی یا سُرخ ہی کپڑے پہنا کرتی تھی۔ گلابی ساڑھی پر سُرخ بلاؤز یا کبھی گلابی کے ساتھ ہلکا گہرا گلابی۔

شادی کے وقت اُس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ مگر دولہن بناتے وقت ایسے تیل چپڑ کر باندھے تھے کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ پر کٹی میم ہے اب اُس کے بال تو بڑھ گئے تھے، لیکن پے در پے بچے ہونے کی وجہ سے وہ ذرا گنجی سی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی وہ بال کس کر میلی ڈھیلی ہی باندھ لیا کرتی تھی۔ اس کے میاں کو وہ میلی کچیلی ایسی ہی بڑی پیاری لگتی تھی اور میکے سسرال والے بھی اس کی سادگی کو دیکھ کر اُس کی تعریفوں کے گُن گاتے تھے۔ بھابی تھی بڑی پیاری سی، سجیل نقشہ مکھن جیسی رنگت، سڈول ہاتھ پاؤں۔ مگر اس نے اس بری طرح اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا کہ خمیرے آٹے کی طرح بہہ گئی تھی۔

بھیا اس سے نو برس بڑے تھے مگر اس کے سامنے لونڈے سے لگتے تھے۔ ویسے ہی سڈول کسرتی بدن والے، روز ورزش کرتے، بڑی احتیاط سے کھانا کھاتے بڑے حساب سے سگریٹ پیتے۔ یونہی کبھی وہسکی بیئر چکھ لیتے۔ اُن کے چہرے پر اب لڑکپن تھا۔ تھے بھی تیس اکتیس برس کے۔ مگر چوبیس پچیس برس کے ہی لگتے تھے۔

اُن بھیا کو میمنؔ اور اسکرٹ سے کیسی نفرت تھی۔ انہیں یہ نئے فیشن کی بے استینوں کی بدن پر چپکی ہوئی قمیض سے بھی بڑی گھن آتی تھی۔ تنگ موری کی شلواروں سے تو وہ ایسے جلتے تھے کہ توبہ خیر، بھابی بے چاری تو شلوار قمیض کے قابل رہ ہی نہیں گئی تھی۔ وہ تو بس زیادہ تر بلاؤز اور پیٹی کوٹ پر ڈریسنگ گاؤن چڑھائے گھوما کرتی۔ کوئی جان پہچان والا آجاتا تو بھی بے تکلفی سے وہی اپنا نیشنل ڈریس پہنے رہتی۔ کوئی پُر تکلف مہمان آتا تو عموماً وہ اندر ہی بچوں سے سر مارا کرتی۔ جو کبھی باہر آنا پڑتا تو ملگجی سی ساڑھی لپیٹ لیتی۔ وہ گھر ہستن تھی، بہو تھی اور پھیلتی تھی، اسے رنڈیوں کی طرح بن سنور کر کسی کو لبھانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور شاید بھابی یونہی گودڑ بنی ادھیڑ اور پھر بوڑھی ہو جاتی۔ بہوئیں بیاہ کر لاتی، جو صبح اٹھ کر اُسے جھک کر سلام کرتیں، گود میں پوتا کھلانے کو دیتیں۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شام کا وقت تھا، ہم سب لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بھابی پاپڑ تلنے باورچی خانہ میں گئی تھی۔ باورچی نے پاپڑ لال کر دیئے بھیا کو بادامی پاپڑ بھاتے ہیں۔

انہوں نے پیار سے بھابی کی طرف دیکھا اور وہ جھٹ سے اُٹھ کر پاپڑ تلنے چلی گئی۔ ہم لوگ مزے سے چلتے پیتے رہے۔ ہائے بھابی بھی کر فرشتہ۔ میں تو کالج سے آ کر باورچی خانہ میں جانے پر کسی طرح مجبور رہی نہیں کی جا سکتی تھی اور نہ ہی میرا شام کا پُر تکلف لباس باورچی خانہ کے لیے موزوں تھا۔ اس کے علاوہ مجھے پاپڑ تلنا ہی کب آتے تھے۔ دوسری بہنیں بھی میری قطار میں کھڑی تھیں۔ فریدہ کا منگیتر آیا تھا۔ وہ اس کی طرف جٹی ہوتی تھی۔ رضیہ اور شمیم اپنے دوستوں کے ساتھ گپیں لڑانے میں مصروف تھیں۔ وہ کیا پاپڑ تلتیں۔ اور ہم سب تو بابل کے آنگن کی چڑیاں تھیں اور اڑنے کے لیے پر تول رہی تھیں۔

دھائیں سے فٹ بال آ کر عین بھیا کی پیالی پر پڑی۔ ہم سب اچھل پڑے۔ بھیا مارے غصہ کے بھنّا اُٹھے۔

"کون پاجی ہے؟" انہوں نے جدھر سے گیند آئی تھی اُدھر دیکھ کر ڈانٹا۔ بکھرے ہوتے گالوں کا گول مول سر اور بڑی بڑی آنکھیں اُوپر سے جھانکیں، ایک زقند میں بھیا منڈیر پر تھے اور مجرم کے بال اُن کی گرفت میں۔

"اوہ!" ایک چیخ گونجی اور دوسرے لمحے بھیا ایسے اُچھل کر الگ ہو گئے جیسے انہوں نے بچھو کے ڈنگ پر ہاتھ ڈال دیا ہو یا انگارہ پکڑ لیا ہو۔

"سوری ——— آئی ایم ویری سوری ———" وہ ہکلا رہے تھے۔ ہم سب دوڑ کر گئے۔ دیکھا تو منڈیر کے اُس طرف ایک دُبلی پتلی ناگن سی لڑکی سفید ڈرین پائپ اور لیمو کے رنگ کا سلیولیس بلاؤز پہنے اپنے میرلین منرو

کی طرح کٹے ہوئے بالوں میں پتلی پتلی انگلیاں پھیر کر کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھی اور پھر ہم سب ہنسنے لگے۔

بھابی پاپڑوں کی پلیٹ لیے اندر سے نکلی اور بغیر پوچھے گچھے یہ سمجھ کر ہنسنے لگی کہ ضرور کوئی ہنسنے کی بات ہوئی ہوگی۔ اُس کا ڈھیلا ڈھالا پیٹ ہنسنے میں پھُدکنے لگا اور جب اسے معلوم ہوا کہ بھیا نے شبنم کو لونڈا سمجھ کر اُس کے بال پکڑ لیے تو وہ اور بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگی کہ کئی پاپڑ کے ٹکڑے گھاس پر بکھر گئے۔ شبنم نے بتایا وہ اسی دن اپنے چچا خالد جمیل کے ہاں آئی ہے۔ اکیلے جی گھبرایا تو ٹینس بال ہی لڑھکانے لگی جو قسمت سے بھیاجی کی پیالی پر آن کودی۔ شبنم بھیا کو اپنی تیکھی مسکارہ لگی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ بھیا مسحور سناٹے میں اُسے تک رہے تھے۔ ایک کرنٹ اُن دونوں کے درمیان دوڑ رہا تھا۔ بھابی اس کرنٹ سے کٹی ہوئی جیسے کوسوں دور کھڑی تھی۔ اس کا پھُدکتا ہوا پیٹ سہم کر رُک گیا۔ ہنسی نے اُس کے ہونٹوں پر لڑکھڑا کر دم توڑ دیا۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے ہو گئے۔ پلیٹ ٹیڑھی ہو کر پاپڑ گھاس پر گرنے لگے۔ پھر ایک دم وہ دونوں جاگ پڑے اور خوابوں کی دنیا سے لوٹ آئے۔

شبنم پھُدک کر منڈیر پر چڑھ گئی۔

"آیئے چائے پی لیجئے۔" میں نے ٹھہری ہوئی فضا کو دھکا دے کر آگے کھسکایا۔ ایک لچک کے ساتھ شبنم نے اپنے پیر منڈیر کے اُس پار سے اس پار جھلائے۔ سفید چھوٹے چھوٹے ٹمکاسن ہری گھاس پر فاختہ کے جوڑے کی طرح ٹھمکنے لگے۔ شبنم کا رنگ پگھلے ہوئے سونے کی طرح لَو دے رہا تھا۔

اُس کے بال سیاہ بھونرا تھے۔ مگر آنکھیں جیسے سیاہ کٹوریوں میں کسی نے شہد بھر دیا ہو۔ لیمو کے رنگ کے بلاؤز کا گلا بہت گہرا تھا۔ ہونٹ تربوزی رنگ کے اور اُسی رنگ کی نیل پالش لگائے وہ بالکل کسی امریکی اشتہار کا ماڈل معلوم ہو رہی تھی۔ بھابی سے کوئی فٹ، بھر لانبی لگ رہی تھی حالانکہ مشکل سے دو دانچ اونچی ہو گی۔ اُس کی ہڈی بڑی نازک تھی۔ اس لیے کمر تو ایسی کہ چھلے میں پرو لو۔

بھیا کچھ گم سم سے بیٹھے تھے۔ بھابی انہیں ایسے تاک رہی تھی جیسے بلی پر تولتے ہوئے پرندے کو گھورتی ہے کہ جیسے ہی پر پھڑ پھڑاتے بڑھ کر دبوچ لے۔ اُس کا چہــــرہ تمتما رہا تھا۔ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔

اتنے میں منا آکر اُس کی پیٹھ پر دھم سے کودا۔ وہ ہمیشہ اُس کی پیٹھ پر ایسے کودا کرتا تھا جیسے وہ کوئی گدگدا سا تکیہ ہو۔ بھابی ہمیشہ ہی ہنس دیا کرتی تھی۔ مگر آج اُس نے چٹاخ پٹاخ دو چار چانٹے جڑ دیئے۔

شبنم پریشان ہو گئی۔

"ارے ارے ــــــ رہنے دیجیے نا ــــــ" اُس نے بھیا کا ہاتھ چھو کر کہا:

"بڑی غصہ ور ہیں آپ کی ممی۔" اُس نے میری طرف منہ پھیر کر کہا۔

انٹروڈکشن ہماری سوسائٹی میں بہت کم ہوا کرتا ہے اور پھر بھابی کا کسی سے انٹروڈکشن کرانا عجیب سا لگتا تھا۔ وہ تو صورت سے ہی گھر کی بہو لگتی تھی۔

شبنم کی بات پر ہم سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ بھابی منّے کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر چل دی۔

"ارے یہ تو ہماری بھابی ہے" میں نے بھابی کو دھم دھم جاتے ہوئے دیکھ کر کہا؛

"بھابی؟" شبنم حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"ان کی بھیا کی بیوی۔"

"اوہ ـــــ" اُس نے سنجیدگی سے اپنی نظریں جھکا لیں۔ "میں سمجھی!" اس نے بات اُدھوری چھوڑ دی۔

"بھابی کی عمر تئیس سال ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"مگر۔۔۔۔ ڈونٹ بی سِلی ـــــ" شبنم ہنسی ـــــ بھیا بھی اُٹھ کر چل دیے۔

"خدا کی قسم۔"

"اوہ ـــــ جہالت۔ ـــ"

"نہیں ـــــ بھابی نے مارٹینز سے پندرہ سال کی عمر میں سینئر کیمبرج کیا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ یہ مجھ سے تین سال چھوٹی ہیں۔ میں چھبیس سال کی ہوں!"

"تب تو قطعی چھوٹی ہیں۔"

"اُف اور میں سمجھی وہ تمہاری ممی ہیں۔ دراصل میری آنکھیں ذرا کمزور ہیں

مگر مجھے عینک سے نفرت ہے۔ بُرا لگا ہوگا انہیں"

"نہیں ــــــ بھابی کو کچھ بُرا نہیں لگتا"

"چہ ــــــ بیچاری" ــــــ

"کون ــــــ بھابی" نا جانے میں نے کیوں کہا۔

"بھیا اپنی بیوی پر جان دیتے ہیں" صفیہ نے بطور وکیل کہا

"بیچارے کی بہت بچپن میں شادی کر دی گئی ہوگی"۔

"پچیس چھبیس سال کے تھے"۔

"مگر مجھے تو معلوم بھی نہ تھا کہ بیسویں صدی میں بھی بغیر دیکھے شادیاں ہوتی ہیں" شبنم نے حقارت سے مسکرا کر کہا۔

"تمہارا اندازہ غلط نکل رہا ہے۔ . . بھیا نے بھابی کو دیکھ کر بےحد پسند کر لیا تھا۔ تب شادی ہوئی تھی۔ مگر جب وہ کنول کے پھول جیسی نازک اور حسین تھیں"۔

"پھر یہ کیا ہو گیا شادی کے بعد ؟"

"ہونا کیا ــــــ بھابی اپنے گھر کی ملکہ ہیں۔ بچوں کی ملکہ ہیں۔ کوئی فلم ایکٹریس تو ہیں نہیں۔ دوسرے بھیا کو سوکھی ماری لڑکیوں سے گھن آتی ہے"۔ میں نے جان کر شبنم پر چوٹ کی۔ وہ بے وقوف نہ تھی۔

"بھئی چاہے مجھ سے کوئی پیار کرے یا نہ کرے۔ میں تو کسی کو خوش کرنے کے لیے ہاتھی کا بچہ کبھی نہ ہوں ــــــ سادہ معاف کرنا تمہاری بھابی کبھی بہت خوبصورت ہوں گی مگر اب تو . . ."

"اُنھ، آپ کا نکتۂ نظر بھیّا سے بالکل مختلف ہے۔ میں نے بات ٹال دی اور جب وہ بل کھاتی سیدھی سڈول ٹانگوں کو آگے پیچھے جھلاتی ننھے ننھے قدم رکھتی منڈیر کی طرف جا رہی تھی۔ بھیا برآمدے میں کھڑے تھے۔ اُن کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اور بار بار اپنی گدّی سہلا رہے تھے۔ جیسے کسی نے وہاں جلتی جلتی آگ رکھ دی ہو۔ چڑیا کی طرح پھُدک کر وہ منڈیر پھلانگ گئی۔ پل بھر کو پلٹ کر اُس نے اپنی مسکراتی آنکھوں سے بھیا کو تولا اور چھلاوہ کی طرح کوٹھی میں غائب ہو گئی۔

بھابی اماں پر جھکی ہوئی پیالیاں سمیٹ رہی تھی۔ مگر اس نے ایک نظر نہ آنے والا تار دیکھ لیا۔ جو بھیّا جی اور شبنم کی نگاہوں کے درمیان دوڑ رہا تھا۔

ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ شبنم پھولا ہوا لال اسکرٹ اور سفید کھلے گلے کا بلاؤز پہنے پپّو کے ساتھ سمبا ناچ رہی تھی۔ اُس کا ننھا سا پکنیز کُتّا ٹانگوں میں اُلجھ رہا تھا۔ وہ اُونچے اُونچے قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کی سڈول سانولی ٹانگیں ہری ہری گھاس پر تھرک رہی تھیں۔ سیاہ ریشمی بال ہوا میں چھلک رہے تھے۔ پانچ سال کا پپّو بندر کی طرح پھدک رہا تھا۔ مگر وہ نشیلی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ اُس نے ناچتے ناچتے ناک پر انگوٹھا رکھ کر مجھے چڑایا۔ میں نے جواب میں گھونسا دکھا دیا۔ مگر فوراً ہی مجھے اُس کی نگاہوں کا پیچھا کر کے معلوم ہوا یہ اشارہ وہ میری طرف نہیں کر رہی تھی۔ بھیّا برآمدے میں احمقوں کی طرح کھڑے گدّی سہلا رہے تھے

اور وہ انھیں منہ چڑاکر جلا رہی تھی۔ اُس کی کمر میں بل پڑ رہے تھے۔ کولہے مٹک رہے تھے۔ بانہیں تھرتھرا رہی تھیں۔ ہونٹ ایک دوسرے سے جدا لرز رہے تھے۔ اُس نے سانپ کی طرح لپ سے زبان نکال کر اپنے ہونٹ کو چاٹا۔ بھیا کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ کھڑے دانت نکال رہے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا ـــــ بھابی گودام میں اناج تلوا کر باورچی کو دے رہی تھی۔

"شبنم کی بچی ـــــ" میں نے دل میں سوچا ـــــ مگر غصّہ مجھے بھیا پر بھی آیا۔ انھیں دانت نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ انھیں تو شبنم جیسی کرنیٹوں سے نفرت تھی۔ انھیں تو انگریزی ناچوں سے گھن آتی تھی۔ پھر وہ کیوں کھڑے اسے تک رہے تھے اور ایسی بھی کیا بے سُدھی کہ اُن کا جسم سنبا کی تال پر لرز رہا تھا اور انھیں خبر نہ تھی۔

اتنے میں بوائے چائے کی ٹرے لے کر لان پر آ گیا ـــــ بھیا نے ہم سب کو آواز دی اور بوائے سے کہا بھابی کو بھیج دے۔

رسماً شبنم کو بلاوا دینا پڑا۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا قطعی اُس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ جاؤں مگر جب وہ منّے کو بڑھی پر چڑھاتے منڈیر پھلانگ کر آئی تو نہ جانے کیوں مجھے وہ قطعی معصوم لگی، منّا اس کا رف لگاموں کی طرح تھامے ہوتے تھا اور وہ گھوڑے کی چال اچھلتی ہوئی لان پہ دوڑ رہی تھی۔ بھیا نے منّے کو اُس کی پیٹھ سے اتارنا چاہا۔ مگر وہ اور چمٹ گیا۔

"ابھی اور گھوڑا چلے آنٹی"

"نہیں بابا ——— آنٹی میں دم نہیں ———" شبنم چلائی۔ بڑی مشکل سے منے کو بھیا نے اتارا۔ منہ پر ایک چانٹا لگا یا ایک دم تڑپ کر شبنم نے اسے گود میں اٹھا لیا اور بھیا کے ہاتھ پر زور کا تھپڑ لگایا۔

"شرم نہیں آتی ——— اتنے بڑے اونٹ کے اونٹ ذرا سے بچے پر ہاتھ اٹھاتے ہیں" بھابی کو آتا دیکھ کر اس نے منے کو ان کی گود میں دے دیا۔ اس کا چانٹا کھا کر بھیا مسکرا رہے تھے۔

"دیکھئے تو کتنی زور سے تھپڑ مارا ہے۔ میرے بچے کو کوئی مارتا تو ہاتھ توڑ کر رکھ دیتی" اس نے شربت کی کٹوریوں میں زہر گھول کر بھیا کو دیکھا "اور پھر ہنس رہے ہیں بے حیا"

"ہوں۔ دم بھی ہے ——— جو ہاتھ توڑ دوگی ———" بھیا نے اس کی کلائی مروڑ دی۔ وہ بل کھا کر اتنی زور سے چیخی کہ بھیا نے لرز کر اسے چھوڑ دیا اور وہ ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ گئی۔ چائے کے درمیان بھی شبنم کی شرارتیں پلتی رہیں۔ وہ بالکل کمسن چھوکریوں کی طرح چہلیں کر رہی تھی۔ بھابی گم سم بیٹھی تھیں۔ آپ سمجھے ہوں گے شبنم کے وجود سے ڈر کر انہوں نے کچھ اپنی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہوگی۔ جی قطعی نہیں۔ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ میلی رہنے لگیں۔ پہلے سے بھی زیادہ کھاتیں۔ ہم سب تو ہنس زیادہ رہے تھے۔ مگر وہ سر جھکائے نہایت انہماک سے کیک اڑانے میں مصروف تھیں۔

چٹنی لگا لگا کر بھیجے نگل رہی تھیں بھیکے ہوئے توسوں پر ڈھیر سا مکھن اور جیلی تھوپ گر دسے کھائے جا رہی تھیں، بھیا اور شبنم کو دیکھ دیکھ کر ہم سب ہی پریشان تھے اور شاید بھابی سنکر مند ہو گی مگر وہ اپنی پریشانی کو مرغن کھانوں میں دفن کر رہی تھیں۔ انہیں ہر وقت کھٹی ڈکاریں آیا کرتیں مگر وہ چورن کھا کھا کر پلاؤ قورمہ ہضم کرتیں۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے بھیا جی اور شبنم کو ہنستا بولتا دیکھتیں۔ بھیا تو کچھ اور بھی لونڈے لگنے لگے تھے۔ شبنم کے ساتھ وہ صبح و شام سمندر میں تیرتے۔ بھابی اچھا بھلا تیرنا جانتی۔ مگر بھیا کو سوئمنگ سوٹ پہنی عورتوں سے بہت نفرت تھی۔ ایک دن ہم سب سمندر میں نہا رہے تھے۔ شبنم ننھی ننھی دو دھجیاں پہنے ناگن کی طرح پانی میں بل کھا رہی تھی۔ اتنے میں بھابی جو دیر سے منے کو پکار رہی تھیں۔ آ گئیں۔ بھیا شرارت کے موڈ میں تو تھے ہی، دوڑ کر انہیں پکڑ لیا اور ہم سب نے مل کر انہیں پانی میں گھسیٹ لیا جب سے شبنم آئی تھیں۔ بھیا بہت شریر ہو گئے تھے۔ ایک دم سے وہ دانت کچکچا کر بھابی کو ہم سب کے سامنے بھینچ لیتے۔ انہیں گود میں اٹھانے کی کوشش کرتے۔ مگر وہ ان کے ہاتھوں میں سے یونہی مچھلی کی طرح پھسل جاتیں۔ پھر وہ کھسیا کر رہ جاتے۔ جیسے تخیل میں وہ شبنم ہی کو اٹھا رہے تھے اور بھابی کٹی گائے کی طرح نادم ہو کر فوراً پڈنگ یا کوئی اور مزے دار ڈش تیار کرنے چلی جاتیں۔ اس وقت جو انہیں پانی میں دھکیلا گیا۔ تو وہ گٹھڑی کی طرح لڑھک گئیں۔ ان کے کپڑے جسم پر چپک گئے اور ان کے جسم کا سارا اجھونڈا پن بھیانک طریقہ پر ابھر

آیا۔ مگر پھر جیسے کسی نے تو شک لپیٹ دی تھی۔ کپڑوں میں وہ اتنی بھیانک نہیں معلوم ہوتی تھیں۔

"اُفوہ کتنی موٹی ہو گئی ہو نم" بھیا نے اُن کے کولہے کا بوٹا پکڑ کر کہا۔

اُف تو ند تو دیکھو ــــــ بالکل گاما پہلوان معلوم ہو رہی ہو۔"

"ہنہہ چار بچے ہونے کے بعد مگر ــــــ"

"میرے تو چار بچے ہیں ــــــ میری کمر تو ڈنلوپلو کا گدا نہیں بنی" اُنہوں نے اپنے سڈول جسم کو ٹھوک بجا کر کہا اور بھابی منہ تھوتھائے بھیگی مرغی کی طرح بیر بارنی جھر جھریاں لیتی ریت میں گھر سے گدھے بنانی نتھے کو گھسیٹتی چلی گئیں۔ بھیا بالکل بے توجہ ہو کر شبنم کو پانی میں ڈبکیاں دینے لگے۔ مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والی تھی۔ ایسا اڑنگا لگایا کہ غڑاپ سے اوندھے منہ گر پڑے۔

جب نہا کر آئے تو بھابی سر جھکائے خوبانوں کے مربے پر کریم کی تہہ جما رہی تھیں، ان کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ گٹارچہ کی گڑیا جیسے موٹے موٹے گال کچھ اور سوجے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

لنچ پر بھابی بے انتہا غمگین تھیں۔ لہٰذا بڑی تیزی سے خوبانیوں کا مربہ اور کریم کھانے پر جٹی ہوئی تھیں۔ شبنم نے ڈش کی طرف دیکھ کر ایسے پھریری لی جیسے خوبانیاں نہ ہوں، سانپ بچھو ہوں۔

"زہر ہے زہر!" اُس نے نفاست سے ککڑی کا ٹکڑا کترتے ہوئے کہا۔

اور بھیا بھابی کو گھورنے لگے۔ مگر وہ شپاشپ مربہ اُڑاتی رہیں۔

"حد ہے!" اُنہوں نے نتھنے پھڑکا کر کہا۔

بھابی نے کوئی دھیان نہ دیا اور تقریب قریب پوری ڈش پیٹ میں انڈیل لی۔ انہیں مربہ سپوڑتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رشک و حسد کے طوفان کو روکنے کے لیے بند باندھ رہی ہوں۔ یہ کریم چربی کی چٹانوں کی صورت میں اُن کے جسم کے قلعے کو ناقابلِ تسخیر بنا دے گی۔ پھر شاید دل میں یوں ٹیسیں نہ اٹھیں گی۔ بھیا جی اور شبنم کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ٹکراؤ سے بھڑکنے والے شعلے ان پتھریلی دیواروں کو نہ پگھلا سکیں گے۔

"خدا کے لیے بس کرو ——— ڈاکٹر بھی منع کر چکا ہے ایسا بھی کیا چٹورپن"۔ بھیا نے کہہ ہی دیا، موم کی دیوار کی طرح بھابی پگھل گئیں۔ بھیا کا نشتر چربی کی تہوں کو چیرتا ہوا ٹھیک دل میں اتر گیا۔ موٹے موٹے آنسو بھابی کے پھولے ہوئے گالوں پر پھسلنے لگے۔ سسکیوں نے جسم کے ڈھیر میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ دُبلی پتلی نازک لڑکیاں کس لطیف اور سہانے انداز میں روتی ہیں۔ مگر بھابی کو روتے دیکھ کر بجائے دُکھ کے ہنسی آتی تھی جیسے کوئی روئی کے بھیگے ہوئے ڈھیر کو ڈنڈوں سے پیٹ رہا ہو۔

وہ ناک پونچھتی ہوئی اٹھنے لگیں مگر ہم لوگوں نے روک لیا اور بھیا کو ڈانٹا خوشامد کر کے واپس انھیں بٹھا لیا۔ بیچاری ناک سڑکاتی بیٹھ گئیں۔ مگر جب انہوں نے کافی میں تین چمچے شکر ڈال کر کریم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ایک دم ٹھٹھک گئیں۔ سہمی ہوئی نظروں سے شبنم اور بھیا کی طرف دیکھا۔ شبنم بمشکل اپنی ہنسی روکے ہوئے تھی بھیا مارے غصے کے روہانسے ہو رہے تھے۔ وہ ایک دم بھنا کر اٹھے اور جا کر برآمدے میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد

حالات اور بگڑے۔ بھابی نے کھلم کھلا اعلانِ جنگ کر دیا۔ کسی زمانے میں بھابی کا پٹھانی خون بہت گرم تھا۔ ذرا سی بات پر ہاتھا پائی پر اتر آیا کرتی تھیں اور بارہا بھیا سے غصّہ ہو کر بجائے منہ پھلانے کے وہ خونخوار بلّی کی طرح اُن پر لوٹ پڑتیں ان کا منہ کھسوٹ ڈالتیں۔ دانتوں سے گریبان کی دھجیاں اُڑا دیتیں۔ پھر بھیا انہیں اپنی بانہوں میں جکڑ کر بے بس کر دیتے اور وہ اُن کے سینے سے لگ کر پیاسی ڈری ہوئی چڑیا کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں پھر ملاپ ہو جاتا اور جھینپی کھسیانی وہ بھیا کے منہ پر لگے ہوئے کھرونچوں پر پیار سے ٹنکچر لگا دیتیں۔ اُن کے گریبان کو رفو کر دیتیں اور میٹھی میٹھی شکر گزار آنکھوں سے انہیں تکتی رہتیں۔

یہ تب کی بات ہے جب بھابی ہلکی پھلکی تیتری کی طرح طرار تھیں لڑتی ہوئی چھوٹی سی لینٹی بلی معلوم ہوتی تھیں۔ بھیا کو ان پر غصّہ آنے کے بجائے اور شدت سے پیار آتا۔ مگر جب سے ان پر گوشت نے جہاد بول دیا تھا۔ وہ بہت ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔ انہیں اوّل تو غصّہ ہی نہ آتا اور اگر آتا بھی تو فوراً اِدھر اُدھر کام میں لگ کر بھول جاتیں۔

اس دن اُنہوں نے اپنے بھاری بھر کم ڈیل کو بھول کر بھیا پر حملہ کر دیا۔ بھیا صرف اُن کے بوجھ سے دھکا کھا کر دیوار سے جا چپکے۔ روئی کے گٹھڑ کو یوں لڑھکتے دیکھ کر انہیں سخت گھِن آئی۔ نہ غصّہ ہوئے، نہ بگڑے، اشرمندہ اُداس سر جھکائے کمرے سے نکل بھاگے۔ بھابی وہیں پسر کر رونے لگیں۔ بات اور بڑھی اور ایک دن بھیا کے سالے آکر بھابی کو لے گئے۔ طفیل

بھابی کے چچازاد بھائی تھے۔ اُنہیں دیکھ کر وہ بچوں کی طرح اُن سے لپٹ کر رو دینے لگیں۔ انہوں نے بھابی کو پانچ سال بعد دیکھا تھا۔ وہ گول گنبد کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سِٹ پٹلائے پھر انہوں نے بھابی کو ننھی بچی کی طرح سینے سے لگا لیا۔ بھیا اس وقت شبنم کے ساتھ کرکٹ کا میچ دیکھنے گئے ہوئے تھے طفیل نے شام تک ان کا انتظار کیا۔ وہ نہ آئے تو مجبوراً بھابی اور بچوں کا سامان تیار کیا گیا۔

جانے سے پہلے بھیا گھڑی بھر کو کھڑے آئے۔

"دہلی کے مکان میں نے اُن کے مہر میں دیئے۔" انہوں نے ڈھٹائی سے طفیل سے کہا۔

"مہر؟" بھابی تھر تھر کانپنے لگی۔"

"ہاں ——— طلاق کے کاغذات وکیل کے ذریعہ پہنچ جائیں گے۔"

"مگر طلاق ——— طلاق کا کیا ذکر ہے۔"؟

"اسی میں بہتری ہے۔"

"مگر ——— بچے ———"؟

"یہ چاہیں تو انہیں لے جائیں ——— ورنہ میں نے بورڈنگ میں انتظام کر لیا ہے۔"

ایک چیخ مار کر بھابی بھیا پر جھپٹیں ——— مگر انہیں کھسوٹنے کی ہمت نہ پڑی سہم کر ٹھٹھک گئیں۔

اور پھر بھابی نے اپنی نسوانیت کی پوری طرح بے آبروئی کر ڈالی۔ وہ

بھیا کے پیروں پر لوٹ گئیں۔ ناک رگڑ ڈالی۔

"تم اُس سے شادی کر لو ــــــ میں کچھ نہ کہوں گی۔ مگر خدا کے لیے مجھے طلاق نہ دو۔ میں یوں ہی زندگی گزار دوں گی۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

مگر بھیا نے نفرت سے بھابی کے تھل تھل کرتے ہوئے جسم کو دیکھا۔ اور منہ موڑ لیا۔

"میں طلاق دے چکا۔ اب ــــــ کیا ہو سکتا ہے۔"

مگر بھابی کو کون سمجھاتا۔ وہ بلبلاتے چلی گئیں۔

"بے وقوف ــــــ" طفیل نے ایک ہی جھٹکے میں بھابی کو زمین سے اٹھا لیا۔ "گدھی کہیں کی، چل اُٹھ" ــــــ اور وہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

کیا دردناک سماں تھا۔ بچے پھوٹ پھوٹ کر رونے میں ہم بھابی کا ساتھ دے رہے تھے۔ اماں خاموش ایک ایک کا منہ تک رہی تھیں۔ ابا کی موت کے بعد ان کی گھر میں کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ بھیا خود مختار تھے بلکہ ہم سب کے سرپرست تھے۔ اماں انہیں بہت سمجھا کر ہار چکی تھیں۔ انہیں اس دن کی اچھی طرح خبر تھی۔ مگر کیا کر سکتی تھیں۔

بھابی چلی گئیں ــــــ فضا ایسی خراب ہو گئی تھی کہ بھیا اور شبنم بھی شادی کے بعد ہل اسٹیشن پر چلے گئے۔

سات آٹھ سال گزر گئے کچھ کم دبیش ٹھیک اندازہ نہیں۔ ہم سب

اپنے اپنے گھروں کی ہوئیں۔ اماں کا انتقال ہو گیا۔ ابا کی موت کے بعد وہ بالکل گم سم ہو کر رہ گئی تھیں۔ انھوں نے بھابی کی طلاق پر بہت رونا پیٹنا مچایا۔ مگر بھیا کے مزاج سے وہ واقف تھیں۔ وہ کبھی ابا کی بھی نہیں سنتے تھے۔ کماؤ پوت اپنا آپ مالک ہوتا ہے۔

آشیانہ اجڑ گیا۔ بھرا ہوا گھر سنسان ہو گیا۔ سب ادھر ادھر اڑ گئے سات آٹھ سال آنکھ جھپکتے نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ کبھی سال دو سال میں بھیا کی کوئی خیر خبر مل جاتی۔ وہ زیادہ تر ہندوستان سے باہر ملکوں کی چک پھیریوں میں الجھے رہے مگر جب ان کا خط آیا کہ وہ بمبئی آرہے ہیں تو بھولا بسرا بچپن پھر سے جاگ اٹھا۔ بھیا جی ٹرین سے اترے تو ہم دونوں بچوں کی طرح لپٹ گئے۔ شبنم مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ ان کا سامان اتر رہا تھا۔ جیسے ہی بھیا سے اس کی خیریت پوچھنے کو مڑی، دھپ سے ایک وزنی ہاتھ میری پیٹھ پر پڑا اور کئی من کا گرم گرم گوشت کا پہاڑ مجھ سے لپٹ گیا۔

"بھابی!" میں نے پلیٹ فارم سے نیچے گرنے سے بچنے کے لیے کھڑکی میں جھول کر کہا۔ زندگی میں میں نے شبنم کو کبھی بھابی نہ کہا تھا۔ وہ لگتی بھی تو شبنم ہی تھی مگر آج میرے منہ سے بے اختیار بھابی نکل گیا۔ شبنم کی پھوار ——— ان چند سالوں میں گوشت اور پوست کا تھودا کیسے بن گئی؟ میں نے بھیا کی طرف دیکھا وہ ویسے ہی دراز قد اور چھریرے تھے۔ ایک تولہ گوشت ادھر نہ ادھر وہی کمسن لڑکوں جیسے گھنے بال۔ بس دو چار سفید چاندی کے تار کنپٹیوں پر جھانکنے لگے تھے جن سے وہ اور بھی حسین اور باوقار معلوم ہونے لگے

تھے۔ دبیسے کے دبیسے چٹان کی طرح جمے ہوئے تھے۔ لہریں تڑپ تڑپ کر چٹان کی اور لپکتی ہیں۔ اپنا سر اُس کے قدموں میں دے مارتی ہیں ــــــ پاش پاش ہو کر بکھر جاتی ہیں۔ معدوم ہو جاتی ہیں۔ ہار تھک کر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ کچھ وہیں اس کے قدموں میں دم توڑ دیتی ہیں اور نئی لہریں پھر سرفروشی کے ارادے سمیٹے چٹان کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔

اور چٹان ــــــ؟ ان سجدوں سے دور ــــــ طنز سے مسکراتا رہتا ہے۔ اٹل، لاپرواہ اور بے رحم! جب بھیا نے شبنم سے شادی کی تو سب ہی نے کہا تھا ــــــ شبنم آزاد لڑکی ہے، پکی عمر کی ہے ــــــ بھابی ــــــ تو یہ میں نے شہناز کو ہمیشہ بھابی ہی کہا۔ ہاں تو شہناز بھولی اور کم سن تھی ــــــ بھیا کے قابو میں آگئی۔ یہ ناگن انہیں ڈس کر بے سُدھ کر دے گی۔ انہیں مزہ چکھائے گی۔

مگر مزہ تو اہر دل کو صرف چٹان ہی چکھا سکتی ہے۔

"بچے بورڈنگ میں ہیں چھٹی نہیں تھی۔ ان کی ــــــ" شبنم نے کٹھی ڈکار دار بھری سانس میری گردن پر چھوڑ کر کہا۔

اور میں حیرت سے اُس گوشت کے ڈھیر میں اُس شبنم کی پھوار کو ڈھونڈ رہی تھی جس نے شہناز کے پیار کی آگ کو بجھا کر بھیا کے کلیجے میں نئی آگ بھڑکا دی تھی۔ مگر یہ کیا؟ بجائے اس آگ میں بھسم ہو جانے کے بھیا تو اور بھی سونے کی طرح تپ کر نکھر آئے تھے۔ آگ خود اپنی تپش میں بھسم ہو کر راکھ کا ڈھیر بن گئی تھی۔ بھابی تو کمھن کا ڈھیر تھی ــــــ مگر شبنم تو جھلسی ہوئی مٹیالی راکھ

تھی ـــــــ اُس کا سانولا کندنی رنگ مری ہوئی چھپکلی کے پیٹ کی طرح اور زرد ہو چکا تھا۔ وہ شربت گھلی ہوئی آنکھیں گدلی اور بے رونق ہو گئی تھیں پتلی ناگن جیسی لچکتی ہوئی کمر کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ مستقل طور پر حاملہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ نازک نازک چمکیلی شاخوں جیسی باہیں مگدر کی طرح گاؤدم ہو گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ پوڈر تھپا ہوا تھا۔ آنکھیں مسکارہ سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ بھنویں شاید غلطی سے زیادہ نچ گئی تھیں، جبھی اتنی گہری پنسل گھسنا پڑی تھی۔

بھیا ٹیز میں بیٹھے ۔ رات کو ڈنر پر ہم وہیں پہنچ گئے۔

کیبرے اپنے پورے عروج پر تھا. مصری حسینہ اپنے چھاتی جیسے پیٹ کو مروڑیاں دے رہی تھی۔ اُس کے کولہے دائروں میں لچک رہے تھے ـــــــ سڈول مرمریں بازو ہوا میں تھرتھرا رہے تھے ـــــــ باریک شفان میں سے اس کی روپہلی ٹانگیں ہاتھی دانت کے ترا شے ہوئے ستونوں کی طرح پھڑک رہی تھیں ـــــــ بھیا کی بھوکی آنکھیں اس کے جسم پر بچھوؤں کی طرح رینگ رہی تھی ـــــــ وہ بار بار اپنی گدی پیا نجانی چوٹ سہلا رہے تھے۔

بھابی ـــــــ جو کبھی شبنم تھی ـــــــ مصری رقاصہ کی طرح لہراتی ہوئی بجلی تھی۔ جو ایک دن بھیا کے حواس پر گری تھی۔ آج ریت کے تودے کی طرح بھسکی بیٹھی تھی۔ اس کے موٹے موٹے گال خون کی کمی اور مستقل بدہضمی کی وجہ سے ممی کی طرح زردی مائل سبز ہو رہے

تھے۔ نیان لائیٹس کی روشنی میں اُس کا رنگ دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کسی انجانے ناگ نے اُسے ڈس لیا ہو۔ مصری رقاصہ کے کولہے طوفان برپا کر رہے تھے اور بھیّا جی کے دل کی ناؤ اس بھنور میں چک پھیریاں کھا رہی تھی، پانچ بچوں کی ماں شبنم ـــــ جو اب بھابی بن چکی تھی، سہمی سہمی نظروں سے انہیں تک رہی تھی۔ دھیان بٹانے کے لیے وہ تیزی سے بھنا ہوا مرغ ہڑپ کر رہی تھی۔

آرکسٹرا نے ایک بھرپور سانس کھینچی ـــــ ساز کراہے ـــــ ڈرم کا دل گونج اٹھا۔ مصری رقاصہ کی کمر نے آخری جھکولے لئے اور نڈھال ہو کر مرمریں فرش پر پھیل گئی۔

ہال تالیوں سے گونج رہا تھا ـــــ شبنم کی آنکھیں بھیّا جی کو ڈھونڈ رہی تھیں ـــــ بیرا ترو تازہ رس بھری اور کریم کا جگ لے آیا۔ بے خیالی میں شبنم نے پیالہ رس بھریوں سے بھر لیا ـــــ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے آنکھیں چوٹ کھائی ہوئی ہرنیوں کی طرح پریشان چوکڑیاں بھر رہی تھیں۔

بھیڑ بھاڑ سے دور ـــــ نیم تاریک بالکنی میں بھیّا کھڑے مصری رقاصہ کا سگریٹ سلگا رہے تھے۔ اُن کی پُرشوق نگاہیں رقاصہ کی نشیلی آنکھوں سے اُلجھ رہی تھیں۔ شبنم کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور وہ ایک بے ہنگم پہاڑ کی طرح گم سم بیٹھی تھی۔ شبنم کو اپنی طرف تکتا دیکھ کر بھیّا رقاصہ کا ہاتھ تھامے اپنی میز کی طرف لوٹ آئے اور ہمارا تعارف کرایا۔

"میری بہن" اُنہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ رقاصہ نے لپک کر میرے وجود کو ہان لیا۔

"میری بیگم" ـــــ انہوں نے فدائی انداز میں کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے کوئی میدانِ جنگ میں کھایا ہوا زخم کسی کو دکھا رہا ہو۔ رقاصہ دم بخود رہ گئی۔ جیسے اس نے اس کی رفیقۂ حیات کو نہیں خود اِن کی لاش کو خون میں غلطاں دیکھ لیا ہو، وہ ہیبت زدہ ہو کر شبنم کو گھورنے لگی۔ پھر اس نے اپنے کلیجے کی ساری ممتا اپنی آنکھوں میں سمو کر بھیّا کی طرف دیکھا اس ایک نظر میں لاکھوں فسانے پوشیدہ تھے۔" آف یہ ہندوستان جہاں جہالت سے کیسی کیسی پیاری ہستیاں رسم و رواج پر قربان کی جاتی ہیں۔ قابلِ پرستش ہیں وہ لوگ اور قابلِ رحم بھی جو ایسی ایسی سزائیں بھگتتے ہیں"۔

" شبنم میری بھابی نے رقاصہ کی نگاہوں میں یہ سب کچھ پڑھ لیا۔ اُس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ پریشانی چھپانے کے لیے اُس نے کریم کا جگ اُٹھا کر رسبھریوں پر انڈیل دیا اور جت گئی۔

بیچارے بھیا جی! ہلیندیسم اور مظلوم ـــــ سورج دیوتا کی طرح حسین اور رومنٹک شہد بھری آنکھوں والے بھیا جی چٹان کی طرح اٹل ـــــ ایک امرشہید کا روپ سجائے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

ایک لہر شوہر خوراں کے قدموں میں پڑی دم توڑ رہی تھی۔
دوسری نئی نویلی لچکتی ہوئی لہر اُن کی پتھریلی باہوں میں سمانے کیلئے بیچین اور بیقرار تھی۔

دو ہاتھ

رام اوتار پر لام سے واپس آرہا تھا۔ بوڑھی مہترانی ابا میاں سے چٹھی پڑھوانے آئی تھی۔ رام اوتار کو چھٹی مل گئی۔ جنگ ختم ہو گئی تھی نا! اس لیے رام اوتار تین سال بعد واپس آرہا تھا۔ بوڑھی مہترانی کی چیپڑ بھری آنکھوں میں آنسو ٹمٹما رہے تھے، مارے شکر گزاری کے وہ دوڑ دوڑ کر سب کے پاؤں چھو رہی تھی۔ جیسے ان پیروں کے مالکوں نے ہی اس کا اکلوتا پوت لام سے زندہ سلامت منگوا لیا۔

بڑھیا پچاس برس ہو گی، پر ستر کی معلوم ہوتی تھی۔ دس بارہ کچے پکے بچے جنے۔ ان میں سے بس رام اوتر دا بڑی منتوں، مرادوں سے جیا تھا۔ ابھی اس کی شادی رچائے سال بھر بھی نہیں بیتا تھا کہ رام اوتار کی پکار آ گئی۔ مہترانی نے بہت واویلا مچائی مگر کچھ نہ چلی اور جب رام اوتار وردی پہن کر آخری بار اس کے پیر چھونے آیا تو اس کی شان و شوکت سے بے انتہا مرعوب ہوئی۔ جیسے وہ کرنل ہی تو ہو گیا تھا۔

شاگرد پیشے میں نوکر مسکرا رہے تھے۔ رام اوتار کے آنے کے بعد جو ڈرامہ ہونے

کی امید تھی۔ سب اسی پہ آس لگائے بیٹھے تھے۔ حالانکہ رام اوتار لام پر توپ، بندوق چھوڑنے نہیں گیا تھا۔ پھر بھی سپاہیوں کا میلا اٹھاتے اٹھاتے اس میں کچھ سپاہیانہ آن بان اور اکڑ پیدا ہو گی۔ بھوری وردی ڈانٹ کر وہ پرانا رام اوتر واقعی نہ رہا ہوگا۔ ناممکن ہے وہ گوری کے کرتوت سنے اور اس کا جوان خون ہتک سے کھول نہ اٹھے۔

بیاہ کر آئی ہے تو کیا مسمی تھی گوری۔ جب رام اوتار رہا اس کا گھونگھٹ فٹ بھر لمبا رہا اور کسی نے اس کے رخ پر نور کا جلوہ نہ دیکھا جب خصم گیا تو کیا بلک بلک کر روئی تھی جیسے اس کی مانگ کا سیندور ہمیشہ کے لیے اڑ رہا ہو۔ تھوڑے دن روئی روئی آنکھیں لیے۔ سر جھکائے میلے کی ٹوکری ڈھوتی پھری۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے گھونگھٹ کی لمبائی کم ہونے لگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے۔ یہ سارا بسنت رت کا کیا دھرا ہے۔ کچھ صاف گو کہتے تھے۔ گوری تھی ہی چھنال۔ رام اوتار کے جاتے ہی قیامت ہو گئی۔ کمبخت ہر وقت ہی ہی ہر وقت اٹھلانا۔ کمر پر میلے کی ٹوکری لے کر کانسے کے کڑے چھنکاتی جدھر سے نکل جاتی، لوگ بدحواس ہو جاتے۔ دھوبی کے ہاتھ سے صابن کی ٹکی پھسل کر حوض میں گر جاتی۔ باورچی کی نظر توے پر سلگتی ہوئی روٹی سے اچٹ جاتی۔ بہشتی کا ڈول کنویں میں ڈوبتا ہی چلا جاتا۔ چپراسیوں تک کی بلا لگی پگڑیاں ڈھیلی ہو کر گردن میں جھولنے لگتیں۔ اور جب یہ سراپا قیامت گھونگھٹ میں سے بان پھینکتی گزر جاتی تو پورا شاگرد پیشہ ایک بے جان لاش کی طرح سکتہ میں رہ جاتا۔ پھر ایک دم چونک کر وہ ایک دوسرے کی دُرگت پر طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں۔ دھوبن مارے غصے کے کلف کی کونڈی لوٹ

دیتی۔ چپراسن چھاتی سے چپٹے لونڈے کے بے بات دھموکے جڑنے لگتی اور باورچی کی تیسری بیوی پر ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا۔

نام کی گوری تھی۔ پر کمبخت سیاہ بہت تھی۔ جیسے اُلٹے توے پر کسی پھوہڑیا نے پراٹھے تل کر چمکتا ہوا چھوڑ دیا ہو۔ چوڑی پھکنا سی ناک، پھیلا ہوا دہانہ، دانت مانجھنے کا اس کی سات پشت نے فیشن ہی چھوڑ دیا تھا۔ آنکھوں میں پلیوں کاجل تھوپنے کے بعد بھی دائیں آنکھ کا بھینگا پن اوجھل نہ ہو سکا۔ پھر بھی ٹیڑھی آنکھ سے نہ جانے کیسے زہر میں بجھے تیر پھینکتی تھی کہ نشانے پر بیٹھ ہی جاتے تھے۔ کمر بھی لچک دار نہ تھی خاصی کٹھلا سی تھی۔ جھوٹن کھا کھا کر دُنبہ ہو رہی تھی۔ چوڑے بھینس کے سے کھُر، جدھر سے نکل جاتی۔ کڑوے تیل کی سڑاند چھوڑ جاتی۔ ہاں آواز میں بلا کی کوک تھی۔ تیج تیوہار پہ لہک کر کجریاں گاتی تو اس کی آواز سب سے اونچی لہراتی چڑھتی چلی جاتی۔

بُڑھیا مہترانی، یعنی اس کی ساس بیٹے کے جاتے ہی اس سے بے طرح بدگمان ہو گئی۔ بیٹھے بٹھائے احتیاطاً گالیاں دے دیتی۔ اس پر نظر رکھنے کے لیے پیچھے پیچھے پھرتی۔ مگر بڑھیا اب ٹوٹ چکی تھی۔ چالیس برس میلا ڈھونڈنے سے اس کی کمر مستقل طور پہ ایک طرف لچک کر وہیں تھم گئی تھی۔ ہماری پرانی مہترانی تھی۔ ہم لوگوں کے اُنول نال اسی نے گاڑے تھے۔ جُوں ہی اماں کے درد لگتے۔ مہترانی دہلیز پر آ کر بیٹھ جاتی۔ بعض وقت لیڈی ڈاکٹر تک کو نہایت مفید ہدایتیں دیتی۔ بلائیات کو دفع کرنے کے لیے کچھ منتر تعویز بھی لا کر پٹی سے باندھ دیتی۔ مہترانی کی گھر میں خاصی بزرگانہ حیثیت تھی۔

اتنی لاڈلی مہترانی کی بہو یکایک لوگوں کی آنکھوں میں کانٹا بن گئی۔ چپراسن اور باورچی

کی تو بات اور تھی۔ ہماری اچھی بھلی بھاوجوں کا ماتھا اسے اٹھلاتے دیکھ کر ٹھنک جاتا۔ اگر وہ اس کمرے میں جھاڑو دینے جاتی جس میں اس کے میاں ہوتے تو وہ ہڑبڑا کر دودھ پیتے بچے کے منہ سے چھاتی چھین کر بھاگتیں کہ کہیں وہ ڈائن ان کے شوہروں پر ٹونا ٹوٹکا نہ کر رہی ہو۔

گوری کیا تھی۔ بس ایک مرکھنا لمبے لمبے سینگوں والا بجار تھا کہ چھوٹا پھرتا تھا لوگ اپنے کانچ کے برتن بھانڈے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر کلیجے سے لگاتے اور جب حالات نے نازک صورت پکڑ لی تو شاگرد پیشے کی مہیلاؤں کا ایک باقاعدہ وفد اماں کے دربار میں حاضر ہوا۔ بڑے زور شور سے خطرہ اور اس کے خوفناک نتائج پر بحث ہوئی۔ پتی رکھشا کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں سب بھاوجوں نے شدومد سے ووٹ دیئے اور اماں کو صدر اعزازی کا عہدہ سونپا گیا، ساری خواتین حسب مراتب زمین، پیڑھیوں اور پلنگ کی ادوائن پہ بیٹھیں۔ پان کے ٹکڑے تقسیم ہوئے اور بڑھیا کو بلایا گیا۔ نہایت اطمینان سے بچوں کے منہ میں دودھ نہ دے کر سبھا میں خاموشی قائم کی گئی اور مقدمہ پیش ہوا۔

"کیوں ری چڑیل، تو نے بہو قطامہ کو چھوٹ دے رکھی ہے کہ ہماری چھاتیوں پہ کودوں دے۔ ارادہ کیا ہے تیرا۔ کیا منہ کالا کرائے گی؟"

مہترانی تو بھری ہی بیٹھی تھی۔ پھوٹ پڑی۔ "کیا کروں بیگم صاحب حرام کھور کو چار چوٹ کی مار بھی دہی لے تو۔ روٹی بھی کھانے کو نہ دیئی۔ پر رانڈ میرے تو بس کی نہیں ہے"

"ارے روٹی کی کیا کمی ہے اسے" بادرچن نے اینٹا پھینکا۔ سہارنپور کی

کی خاندانی بادو جن اور پھر تیسری بیوی۔ کیا تیہا تھا کہ اللہ کی پناہ! پھر چپڑاسن، مالن اور دھوبن نے مقدمہ کو اور سنگین بنا دیا۔ بیچاری مہترانی بیٹھی سب کی تاڑ سنتی اور اپنی خارشش زدہ پنڈلیاں کھجلاتی رہی۔

"بیگم صاحب آپ جیسی تباؤ ویلے کرنے سے موئے نا تھوڑی۔ پر کا کروں کا رانڈ کا ٹینٹوا دبائے دیوں ——؟

ٹینٹوا دبنے کے حسین خیال سے مہیلاؤں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور سب کو بڑھیا سے بے انتہا ہمدردی پیدا ہو گئی۔

اماں نے رلئے دی۔ یہ موئی کو میکے پھنکوا دے"

اے بیگم صاحب کہیں ایسا ہو سکے ہے؟" مہترانی نے بتایا کہ بہو مفت ہاتھ نہیں آئی ہے۔ ساری عمر کی کمائی پورے دو سو جھونکے ہیں تب مسٹنڈی ہاتھ آئی ہے۔ اتنے پیسوں میں تو دو گائیں آجاتیں۔ مزے سے بھر کلسی دودھ دیتیں۔ پر یہ رانڈ تو دولتیاں ہی دیتی ہے۔ اگر اسے میکے بھیج دیا گیا تو اس کا باپ اسے فوراً دوسرے مہتر کے ہاتھ بیچ دے گا۔ بہو صرف بیٹے کے بستر کی زینت ہی تو نہیں، دو ہاتھوں والی ہے۔ پر چار آدمیوں کا کام نپٹاتی ہے۔ رام اوتار کے جانے کے بعد بڑھیا سے اتنا کام کیا سنبھلتا۔ یہ بڑھاپا تو اب بہو کے دو ہاتھوں کے صدقے میں بیت رہا ہے۔

مہیلائیں کوئی ناسمجھ نہ تھیں۔ معاملہ اخلاقیات سے ہٹ کر اقتصادیات پر آگیا تھا واقعی بہو کا وجود بڑھیا کے لیے لازمی تھا۔ دو سو روپے کا مال کس کا دل ہے کہ پھینک دے۔ ان دو سو کے علاوہ بیاہ پر جو بنئے سے لیکر خرچ کیا تھا، جمان کھلائے تھے

برادری کو راضی کیا تھا۔ یہ سارا خرچہ کہاں سے آئے گا۔ رام اوتار کی جو تنخواہ ملتی تھی، وہ ساری ادھار میں ڈوب جاتی تھی۔ ایسی موٹی تازی بہو اب تو چار سو سے کم نہ ملے گی پوری کوٹھی کی صفائی کے بعد اور آس پاس کی چار کوٹھیاں نمٹاتی ہے۔ رانڈ کام میں چوکس ہے ویسے۔

پھر بھی اماں نے الٹی میٹم دے دیا کہ "اگر اس کُٹنی کا جلد از جلد کوئی انتظام نہ کیا گیا تو کوٹھی کے احاطہ میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔"

"بڑھیا نے بہت واویلا مچائی۔ اور جا کر بہو کو منہ بھر بھر کر گالیاں دیں۔ جھونٹے پکڑ کر مارا پیٹا بھی۔ بہو اس کی زرخیز تھی۔ پٹتی رہی، بڑبڑاتی رہی اور دوسرے دن انتقاماً سارے محلے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ باورچی، بہشتی، دھوبی اور چپراسیوں نے تو اپنی بیویوں کی مرمت کی۔ یہاں تک کہ بہو کے معاملہ پر میری مہذب بھائیوں اور شریف بھائیوں میں بھی کھٹ پٹ اور بھابیوں کے میکے تار جانے لگے۔ غرض بہو بھرے پرے خاندان کے لیے مسئی کا کانٹا بن گئی۔

مگر دو چار دن کے بعد بوڑھی مہترانی کے دیور کا لڑکا رتی رام اپنی تائی سے ملنے آیا۔ پھر وہیں رہ پڑا۔ دو چار کوٹھیوں میں کام بڑھ گیا تھا سو وہ بھی اس نے سنبھال لیا۔ اپنے گاؤں میں آوارہ ہی تو گھومتا تھا۔ اس کی بہو ابھی نابالغ تھی اس لئے گونا نہیں ہوا تھا۔

رتی رام کے آتے ہی موسم ایک دم لوٹ پوٹ کر بالکل ہی بدل گیا جیسے گھنگھور گھٹائیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ تتر بتر ہو گئیں۔ بہو کے قہقہے خاموش ہو گئے کانسے کے کڑے گونگے ہو گئے۔ اور جیسے غبارے سے ہوا نکل جائے تو وہ چپ چاپ

جھولنے لگتا ہے۔ ایسے بہو کا گھونگھٹ جھولتے جھولتے نیچے کی طرف بڑھنے لگا اب وہ بجائے بے نتھے بیل کے نہایت شرمیلی بہو بن گئی۔ جملہ مہیلاؤں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسٹاف کے مردوں نے اسے چھیڑتے بھی تو وہ چھوٹی موٹی کی طرح لجاجاتی اور زیادہ آنکھ دکھاتے تو وہ گھونگھٹ میں سے بھینگی آنکھ کو اور ترچھا کر کے رتی رام کی طرف دیکھتی جو فوراً بازو کھجلاتا سامنے آکر ڈٹ جاتا بڑھیا پرسکون انداز میں دہلیز پر بیٹھی ادھ کھلی آنکھوں سے یہ طربیہ ڈرامہ دیکھتی اور گڑگڑی پیا کرتی۔ چاروں طرف ٹھنڈا ٹھنڈا سکون چھا گیا۔ جیسے پھوڑے کا مواد نکل گیا ہو۔

مگر اب کے بہو کے خلاف ایک نیا محاذ قائم ہو گیا اور وہ عملے کی مرد جاتی پر مشتمل تھا۔ بات یہ بات باورچی جو اسے پراٹھے تل کر دیا کرتا تھا کونڈی صاف نہ کرنے پر گالیاں دینے لگا۔ دھوبی کو شکایت تھی کہ وہ کلف لگا کر کپڑے رسی پر ڈالتا ہے۔ یہ حرامزادی خاک اڑانے آجاتی ہے۔ چپراسی مردانے میں دس دس مرتبہ جھاڑو دلواتے پھر بھی وہاں کی غلاظت کا رونا روتے رہتے۔ بہشتی جو اس کے ہاتھ دھلانے کے لیے کئی منٹیں سے تیار رہتا تھا، اب گھنٹوں صحن میں چھڑکاؤ کرنے کو کہتی۔ مگر ٹالتا رہتا تاکہ وہ سوکھی زمین پر جھاڑو دے تو چپراسی گرد اڑانے کے جرم میں اسے گالیاں دے سکے۔

مگر بہو سر جھکائے سب کی ڈانٹ پھٹکار ایک کان سنتی دوسرے کان اڑا دیتی۔ نہ جانے ساس سے کیا جا کر کہہ دیتی کہ وہ کائیں کائیں کر کے سب کا بھیجا چاٹنے لگتی۔ اب اس کی نظر میں بہو نہایت پارسا اور نیک ہو چکی تھی۔

پھر ایک دن داڑھی والے داروغہ جی جو تمام نوکروں کے سردار تھے اور ابا کے

خاص مشیر سمجھے جاتے تھے۔ آبا کے حضور میں دست بستہ حاضر ہوئے اور اس بھیانک بدمعاشی اور غلاظت کا رونا رونے لگے جو بہو اور رتی رام کے ناجائز تعلقات سے سارے شاگرد پیشے کو گندہ کر رہی تھی۔ آبا نے معاملہ سیشن سپرد کر دیا یعنی اماں کو پکڑا دیا۔ مہیلاؤں کی سبھا بھر سے جھڑی اور بڑھیا کو بلا کر اس کے لتے لیے گئے۔

اری نگوڑی خبر بھی ہے۔ یہ تیری بہو قطامہ کیا گل کھلا رہی ہے؟"

مہترانی نے ایسے چندھرا کر دیکھا جیسے کچھ نہیں سمجھتی غریب کہ کس کا ذکر ہو رہا ہے، اور جب اسے صاف صاف بتایا کہ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ بہو اور رتی رام کے تعلقات نازیبا حد تک خراب ہو چکے ہیں۔ دونوں بہت ہی قابل اعتراض حالتوں میں پکڑے گئے ہیں تو اس پہ بڑھیا بجائے اپنی بہتری چاہنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کے بہت چراغ پا ہوئی۔ بڑی واویلا مچانے لگی کہ رام اوتر دا ہوتا تو ان لوگوں کی خبر لیتا جو اس کی معصوم بہو پہ تہمت لگاتے ہیں بہو نگوڑی تو اب چپ چاپ رام اوتار کی یاد میں آنسو بہایا کرتی ہے۔ کام کاج بھی جان توڑ کر کرتی ہے۔ کسی کو شکایت نہیں ہوتی۔ ٹھٹول بھی نہیں کرتی۔ لوگ اس کے ناحق دشمن ہو گئے ہیں۔ بہت سمجھایا مگر وہ ماتم کرنے لگی کہ ساری دنیا اس کی جان کی لاگو ہو گئی ہے آخر بڑھیا اور اس کی معصوم بہو نے لوگوں کا کیا بگاڑا ہے، وہ تو کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ وہ تو سب کی راز دار ہے۔ آج تک اس نے کسی کا بھانڈا نہیں پھوڑا اسے کیا ضرورت جو کسی کے پھٹے میں پیر اڑاتی پھرے۔ کوٹھیوں کے پچھواڑے کیا نہیں ہوتا؟ مہترانی سے کسی کا میلا نہیں چھپتا۔ ان بوڑھے ہاتھوں نے بڑے لوگوں کے گناہ دفن کیے ہیں۔ یہ دو ہاتھ چاہیں تو رانیوں کے تخت الٹ دیں۔ پر

نہیں۔ اُسے کسی سے بُغض نہیں۔ اگر اس کے گلے پر چھری دبائی گئی تو شاید غلطی ہو جائے
ویسے وہ کسی کے راز اپنے بوڑھے کلیجے سے باہر نہیں نکلنے دے گی۔

اس کا متیہا دیکھ کر فوراً چھُری دبانے والوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ ساری
مہیلائیں اس کی ہنک کرنے لگیں۔ بہو کچھ بھی کرتی تھی۔ ان کے اپنے قلعے تو محفوظ تھے۔
تو پھر شکایت کیسی؟ پھر کچھ دن کے لیے بہو کے عشق کا چرچا کم ہونے لگا لوگ کچھ
بھولنے لگے۔ مگر تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ بہو کا بھاری بھر
کم جسم بھی دال کے کالے کو زیادہ دن نہ چھپا سکا اور لوگ شدومد سے بڑھیا کو بھلانے
لگے۔ مگر اس نئے موضوع پر بڑھیا بالکل اڑن گھائیاں بتانے لگی۔ بالکل ایسی بن
جاتی جیسے ایک دم اونچا سُننے لگی ہے۔ اب وہ زیادہ تر کھاٹ پر لیٹی بہو اور
رتی رام پر حکم چلایا کرتی۔ کبھی کھانستی چھینکتی باہر دھوپ میں آ بیٹھتی تو وہ دونوں
اس کی ایسی دیکھ ریکھ کرتے جیسے کوئی پٹ رانی ہو۔

بھلی بیویوں نے اُسے بہت سمجھایا۔ رتی رام کا منہ کالا اور اس سے پہلے کہ
رام اوتار لوٹ کر آئے بہو کا علاج کروا ڈال۔ وہ خود اس فن میں ماہر تھی دو دن میں
صفائی ہو سکتی ہے۔ مگر بڑھیا نے کچھ سمجھ کر ہی نہ دیا۔ بالکل ادھر اُدھر کی شکائتیں
کرنے لگی کہ اس کے گھٹنوں میں پہلے سے زیادہ اینٹھن ہوتی ہے۔ نیز کوٹھیوں میں
لوگ بہت ہی زیادہ بادی چیزیں کھانے لگے ہیں۔ کسی نہ کسی کوٹھی میں دست لگے ہی
رہتے ہیں۔ اس کی ٹال مٹول پر ناصحین جل کر مرنڈ ہو گئے۔ مانا کہ بہو عورت ذات ہے،
ناداں ہے، بھولی ــــ بڑی بڑی شریف زادیوں سے خطا ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کی
اعلیٰ خاندان کی معزز ساسیں یوں کان میں تیل ڈال کر نہیں بیٹھ جاتیں۔ پر نہ جانے یہ بڑھیا

کیوں سٹھیا گئی تھی۔ جس بلا کو وہ بڑی آسانی سے کوٹھی کے کوڑے کی تہہ میں دفن کرسکتی تھی۔ اسے آنکھیں میچے پلنے دے رہی تھی۔

رام اوتر دا کے آنے کا انتظار تھا۔ ہر وقت دھمکیاں تو دیتی رہتی تھی۔

"دو آن دے رام، او تر دا کا۔ کہاں گی۔ تو ری ہڈی پسلی ایک کر دیتیہے" اور اب رام اوتر والام سے زندہ واپس آرہا تھا۔ فضا نے سانس روک لی تھی۔ لوگ ایک مہیب ہنگامے کے منتظر تھے۔

مگر لوگوں کو سخت کوفت ہوئی جب بہو نے لونڈا جنا۔ بجائے اسے زہر دینے کے بڑھیا کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ رام اوتار کے جانے کے دو سال بعد پوتا ہونے پر قطعی متعجب نہ تھی۔ گھر گھر پھٹے پرانے کپڑے اور بدھائی سمیٹتی پھری اس کا بھلا چاہنے والوں نے اسے حساب لگا کر بہت سمجھایا کہ لونڈا رام اوتار کا ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر بڑھیا نے قطعی سمجھ کر نہ دیا۔ اس کا کہنا تھا، اساڑھ میں رام اوتار لام پہ گیا۔ جب بڑھیا پیلی کوٹھی کے نئے انگریزی وضع کے سنڈاس میں گر پڑی تھی۔ اب چیت لگ رہا ہے اور جیٹھ کے مہینے میں بڑھیا کو لو لگی تھی۔ مگر بال بال بچ گئی تھی۔ جبھی سے اس کے گھٹنوں کا درد بڑھ گیا۔ "ویدجی پورے حرامی ہیں۔ دوا میں کھریا ملا کر دیتے ہیں۔" اس کے بعد وہ بالکل اصل سوال سے ہٹ کر کھیلاڑوں کی طرح اول فول بکنے لگتی۔ کس کے دماغ میں اتنا بوتا تھا کہ وہ بات اس کائیاں بڑھیا کو سمجھاتا جسے نہ سمجھنے کا وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

لونڈا پیدا ہوا تو اس نے رام اوتار کو چٹھی لکھوائی۔

"رام اوتار کو بعد چمّا پیار کے معلوم ہو کہ یہاں سب کشل ہیں اور تمہاری

کنلتا بھگوان سے نیک بچا ہتے ہیں اور تمہارے گھر میں پوت پیدا ہوا ہے۔ سو تم اس خط کو تار سمجھو اور جلدی سے آجاؤ۔"

لوگ سمجھتے تھے کہ رام اوتار ضرور چراغ پا ہوگا۔ مگر سب کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ جب رام اوتار کا مسرت سے لبریز خط آیا کہ وہ لونڈے کے لیے موزے اور بنیائن لا رہا ہے۔ جنگ ختم ہوگئی اور اب بس وہ آنے ہی والا تھا۔ بڑھیا پوتے کو گھٹنے پر لٹائے کھاٹ پر بیٹھی راج کیا کرتی۔ بھلا اس سے زیادہ حسین بڑھاپا کیا ہوگا۔ کہ ساری کوٹھیوں کا کام ترت پھرت ہو رہا ہو۔ مہاجن کا سود پابندی سے چک رہا ہو اور گھٹنے پر پوتا سو رہا ہو۔

خیر، لوگوں نے سوچا، رام اوتار آئے گا، اصلیت معلوم ہوگی تب دیکھ لیا جائے گا اور اب رام اوتار جنگ جیت کر آرہا تھا۔ آخر کو سپاہی ہے، کیوں نہ خون کھولے گا۔ لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ شاگرد پیشے کی فضا جو بہو کی ترتا چشمی کی وجہ سے سوگئی تھی، دو چار خون ہونے اور ناک کٹنے کی آس میں جاگ اٹھی۔

لونڈا سال بھر کا ہوگا جب رام اوتار لوٹا۔ شاگرد پیشے میں کھلبلی مچ گئی۔ باورچی نے ہانڈی میں ڈھیر سا پانی جھونک دیا تاکہ اطمینان سے جھگڑے کا لطف اٹھائے۔ دھوبی نے کلف کا برتن اتار کر منڈیر پر رکھ دیا اور بہشتی نے ڈول کنوئیں کے پاس ٹیک دیا۔

رام اوتار کو دیکھتے ہی بڑھیا اس کی کمر سے لپٹ کر چنگھاڑنے لگی۔ مگر دوسرے لمحے کھیسیں کاڑھے لونڈے کو رام اوتار کی گود میں دے کر ایسے ہنسنے لگی جیسے کبھی روئی ہی نہ ہو۔

رام اوتار لونڈے کو دیکھ کر ایسے شرمانے لگا جیسے وہی اس کا باپ ہو بھٹ بٹ

اُس نے صندوق کھول کر سامان نکالنا شروع کیا۔ لوگ سمجھے کُھکری یا چاقو نکال رہا ہے مگر جب اس نے اس میں سے لال بنیائن اور پیلے موزے نکالے تو سارے محلے کی قوتِ مردانہ پر ضرب کاری لگی۔ بہت ترس کی، سالا سپاہی بنتا ہے۔ ہیجڑا زمانے بھر کا۔

ادھر بہو اسمٹی سمٹائی جیسے نئی نویلی دولہن نے۔ کانسی کی تھالی میں پانی بھر کر رام اوتار کے بدبودار فوجی بوٹ اتارے اور چرن دھو کر پیئے۔!

لوگوں نے رام اوتار کو سمجھایا۔ بھبتیاں کسیں، اسے گاؤدی کہا۔ مگر وہ گاؤدی کی طرح کھیسیں کاڑھے ہنستا رہا جیسے اس کے سمجھ میں نہ آرہا ہو، رتی رام کا گونا ہونے والا تھا، سو وہ چلا گیا۔

رام اوتار کی اس حرکت پر تعجب سے زیادہ لوگوں کو غصہ آیا۔ ہمارے آبا جو عام طور پر نوکروں کی باتوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے تھے۔ وہ بھی جز بز ہو گئے۔ اپنی ساری قانون دانی کا داؤ لگا کر رام اوتار کو قائل کرنے پر تُل گئے۔

"کیوں بے، تو تین سال بعد لوٹا ہے نا؟"

"معلوم نہیں حجور، تھوڑا کم جیادہ۔۔۔۔ اتنا ہی رہا ہوگا۔"

"ادھر لونڈا سال بھر کا ہے۔"

"اتنا ہی لگے ہے سرکار، پر بڑا بدماس ہے سسرا۔" رام اوتار شرملے۔

"ابے تو حساب لگالے!"

"حساب؟ ۔۔۔۔ کیا لگاؤں سرکار؟" رام اوتار نے مرگلی آواز میں کہا۔

"اُلّو کے پٹھے یہ کیسے ہوا؟"

"اب ہے میں کا جانوں سرکار... بھگوان کی دین ہے"

"بھگوان کی دین! تیرا سر...... یہ لونڈا تیرا نہیں ہو سکتا"

ابا نے اسے چاروں اور سے گھیر کر قائل کرنا چاہا کہ لونڈا حرامی ہے۔

تو وہ کچھ کچھ قائل سا ہو گیا۔ پھر مری ہوئی آواز میں احمقوں کی طرح بولا۔

"تو اب کا کروں سرکار.... حرامجادی کو میں نے بڑی ملدری!" وہ غصے سے پھر کر بولا۔

"ابے اُلو کا پٹھا ہے تو.... نکال باہر کیوں نہیں کرتا کمبخت کو"

"وہ نہیں سرکار، کہیں ایسا ہو سکے ہے!" رام اوتار گھگھیانے لگا۔

"کیوں بے؟"

"حجور، ڈھائی تین سو پھر دوسری سگائی کے لیے کاں سے لاؤں گا اور برادری جمانے میں سو دو سو الگ کھرچ ہو جائیں گے"

"کیوں بے، تجھے برادری کو کیوں کھلانی پڑے گی؟ بہو کی بدمعاشی کا تاوان تجھے کیوں بھگتنا پڑے گا؟"

"ہے میں نہ جانوں سرکار۔ ہمارے میں ایسا ہی ہووے ہے۔"

"مگر لونڈا تیرا نہیں رام اوتار.... اس حرامی رتی رام کا ہے" ابا نے عاجز آکر سمجھایا۔

"تو کا ہوا سرکار.... میرا بھائی ہوتا ہے۔ رتی رام۔ کوئی گیر نہیں، اپنا ہی کھون ہے۔"

"نرا اُلو کا پٹھا ہے" ابا بھنا اٹھے۔

"سرکار، لونڈا بڑا ہو جاوے گا، اپنا کام سمیٹے گا۔ اپنا کام سمیٹے گا" رام اوتار نے

گڑ گڑا کر سمجھایا۔

وہ دو ہاتھ لگائے گا۔ سو اپنا بڑھاپا تیر ہو جائے گا:۔ ندامت سے رام اوتار کا سر جھک گیا۔

اور نہ جانے کیوں، ایک دم رام اوتار کے ساتھ ساتھ آیا کا سر بھی جھک گیا۔ جیسے ان کے ذہن پر لاکھوں کروڑوں ہاتھ چھا گئے۔ . . . . یہ ہاتھ حرامی ہیں نہ حلالی۔ یہ تو بس جیتے جاگتے ہاتھ ہیں جو دنیا کے چہرے سے غلاظت دھو رہے ہیں۔ اسکے بڑھاپے کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔

یہ ننھے منّے مٹی میں لتھڑے ہوئے سیاہ ہاتھ دھرتی کی مانگ میں سیندور سجا رہے ہیں۔

سب کے چہرے فق تھے گھر میں کھانا بھی نہ پکا تھا۔ آج چھٹا روز تھا۔ بچے اسکول چھوڑے گھروں میں بیٹھے اپنی اور سارے گھر والوں کی زندگی وبال کیے دے رہے تھے۔ وہی مارکٹائی دھول دھپا، وہی اودھم اور قلا بازیاں جیسے ۱۵؍اگست آیا ہی نہ ہو۔ کمبختوں کو یہ بھی خیال نہیں کہ انگریز چلے گئے اور چلتے چلتے ایسا گہرا گھاؤ مار گئے جو برسوں رسے گا۔ ہندوستان پر عمل جراحی کچھ ایسے نکمے ہاتھوں اور گٹھل نشتروں سے ہوا ہے کہ ہزاروں شریانیں کٹ گئی ہیں۔ خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ کسی میں اتنی سکت نہیں کہ ٹانکہ لگا سکے۔

کوئی اور معمولی دن ہوتا تو کمبختوں سے کہا جاتا باہر کالا منہ کرکے غدر مچاؤ لیکن چند روز سے شہر کی فضا ایسی غلیظ ہو رہی تھی کہ شہر کے سارے مسلمان ایک طرح سے نظر بند بیٹھے تھے۔ گھروں میں تالے پڑے تھے اور باہر پولیس کا پہرہ تھا۔ لہٰذا کلیجے کے ٹکڑوں کو سینے پر کودوں دلنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ ویسے سول لائن

بلیں امن ہی تھا جیسا کہ عام طور پر رہتا ہے۔ یہ تو گندگی وہیں زیادہ اچھلتی ہے جہاں چھ بچے ہوتے ہیں جہاں غربت ہوتی ہے۔ وہیں جہالت کے گھوڑے پر نام نہاد مذہب کے ڈھیر بجھاتے ہیں اور یہ ڈھیر کریدے جا چکے تھے۔ اوپر سے پنجاب سے آنے والوں کی دن بدن بڑھتی ہوئی تعداد اقلیت کے دل میں دہشت بٹھا رہی تھی۔ غلاظت کے ڈھیر تیزی سے کریدے جا رہے تھے اور عفونت رینگتی رینگتی صاف ستھری سڑکوں پر پہنچ چکی تھی۔ دو جگہ تو کھلم کھلا مظاہرے بھی ہوئے لیکن مارواڑ کی ریاستوں کے ہندو مسلمان کی اس قدر ملتی جلتی معاشرت ہے کہ انہیں نام صورت یا لباس سے بھی باہر والے شکل سے پہچان سکتے ہیں۔ باہر والے اقلیت کے لوگ بھی آسانی سے پہچانے جا سکتے تھے۔ وہ تو پندرہ اگست کی لو پا کر ہی پاکستان کی حدود میں کھسک گئے تھے۔ رہے ریاست کے قدیم باشندے تو نہ ہی ان میں اتنی سمجھ اور نہ ہی ان کی اتنی حیثیت کہ پاکستان اور ہندوستان کا دقیق مسئلہ انہیں کوئی بیٹھ کر سمجھاتا جنہیں سمجھنا تھا وہ سمجھ چکے تھے اور وہ محفوظ ہو چکے تھے۔ باقی جو یہ سن کر گئے تھے کہ چار سیر کا گیہوں اور چار آنے کی ہاتھ بھر لمبی نان پاؤ ملتی ہے وہ لوٹ رہے تھے، کیونکہ وہاں جا کر انہیں یہ بھی پتہ چلا کہ چار سیر کا گیہوں خریدنے کے لیے ایک روپیہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ہاتھ بھر لمبی نان پاؤ کے لیے پوری چونی دینا پڑتی ہے اور یہ روپیہ اٹھنیاں نہ ہی کسی دوکان پر ملیں اور نہ کھیتوں میں اگیں۔ انہیں حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا زندہ رہنے کی تگ و دو۔

لہٰذا جب کھلم کھلا علاقوں سے اقلیت کو نکالنے کی رائے ہوئی تو بڑی

مشکل آن پڑی۔ ٹھاکروں نے صاف کہہ دیا کہ صاحب رعایا ایسی گتھی ملی رہتی ہے مسلمانوں کو بین کر کے نکالنے کے لیے باقاعدہ سٹاف کی ضرورت ہے جو کہ بے کار زائد خرچ ہے ویسے آپ اگر کوئی ٹکڑے زمین کے شرنارتھیوں کے لیے خریدنا چاہیں تو وہ خالی کرائے جا سکتے ہیں۔ جانور تو رہتے ہی ہیں۔ جب کہیے جنگل خالی کرا دیا جائے۔

اب باقی رہ گئے چند گنے چنے خاندان جو یا تو مہاراجہ کے چہیلے چانٹوں میں سے تھے اور جن کے جانے کا سوال نہ تھا یا وہ جو جانے کو تلے بیٹھے تھے۔ بس بستر بندھ رہے تھے۔ ہمارا خاندان بھی اسی فہرست میں آتا تھا جب تک بڑے بھائی اجمیر سے نہ آئے تھے کچھ ایسی جلدی نہ تھی مگر انہوں نے تو آکر لو کھلا ہی دیا۔ پھر بھی کسی نے زیادہ اہمیت نہ دی۔ وہ تو شاید کسی کے کان پر جوں نہ رینگتی اور برسوں اسباب نہ بندھ چکتا جو اللہ بھلا کرے چھبا میاں کا وہ پینترا نہ چلتے۔ بڑے بھائی تو جانے ہی والے تھے کہہ کر ہار گئے تھے تو میاں چھبا نے کیا کیا کہ ایک دم اسکول کی دیوار پر "پاکستان زندہ باد" لکھنے کا فیصلہ کر لیا روپ چند جی کے بچوں نے اس کی مخالفت کی اور فوراً ابگاڑ کر اکھنڈ ہندوستان" لکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ چل گیا جوتا اور ایک دوسرے ہی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سعی فرمائی گئی، بات بڑھ گئی، حتیٰ کہ پولیس بلائی گئی اور جو چند گنتی کے مسلمان بچے تھے۔ انہیں لاری میں بھر کر گھروں کو بھجوا دیا گیا۔

اب سنیے کہ جوں ہی بچے گھر میں آئے ہمیشہ ہیضہ طاعون کے سپرد کرنے والی مائیں۔ ماتا سے بے قرار ہو کر دوڑیں اور انہیں کلیجے سے لگا لیا گیا

اور کوئی دن ہوتا اور روپ چند جی کے بچوں سے چھپا لڑکر آتا تو دلہن بھابی اس کی وہ جوتیوں سے مرہم پٹی کرتیں کر تو بہ بھلی اور اٹھا کر انہیں روپ چند جی کے پاس بھیج دیا جاتا کہ پلائے اُسے ارنڈی کا تیل اور کونین مکسچر کیونکہ روپ چند جی ہمارے خاندانی ڈاکٹر ہی نہیں ابا کے پرانے دوست تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی دوستی ابا سے۔ ان کے بیٹوں کی بھائیوں سے۔ بہوؤں کی ہماری بھاوجوں سے اور نئی پود کی نئی پود سے آپس میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ دونوں خاندانوں کی موجودہ تین پیڑھیاں ایک دوسرے سے ایسی گھلی ملی تھیں کہ شبہ بھی نہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد اس محبت میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ حالانکہ دونوں خاندانوں میں مسلم لیگی کانگریسی اور مہا سبھائی موجود تھے اور مذہبی اور سیاسی بحثیں بھی جم جم کر ہوتیں مگر ایسے ہی جیسے فٹ بال یا کرکٹ میچ ہوتے ہیں۔ ادھر ابا کانگریسی تھے تو ادھر ڈاکٹر صاحب اور بڑے بھائی لیگی تھے تو ادھر گیان چند مہا سبھائی ادھر منجھلے بھائی کمیونسٹ تھے تو ادھر گلاب چند سوشلسٹ اور پھر اسی حساب سے مردوں کی بیویاں اور بچے بھی اسی پارٹی کے تھے۔ عام طور پر جب مچیٹا ہوتا تو کانگریس کا پلہ بھاری پڑتا۔ کمیونسٹ سوشلسٹ بھی گالیاں کھاتے۔ مگر کانگریس ہی میں گھس پڑتے۔ رہ جاتے مہا سبھائی اور لیگی یہ دونوں ہمیشہ ساتھ دیتے۔ گو وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوتے پھر بھی دونوں مل کر کانگریس پر حملہ کرتے۔

لیکن ادھر کچھ سال سے مسلم لیگ کا زور بڑھتا گیا اور ادھر مہا سبھا کا۔ کانگریس کا تو بالکل بیڑا ہو گیا۔ بڑے بھائی کی سپاہ سالاری میں گھر کی ساری نئی پود سوائے دو ایک غیر جانب دار قسم کے کانگریسیوں کو چھوڑ کر نیشنل گارڈ کی طرح ڈٹ گئی

ادھر گیان چند کی سرداری میں سیوک سنگھ کا چھوٹا سا دل ٹوٹ گیا۔ مگر دوستی اور محبت میں فتور نہ آیا۔

"اپنے للو کی شادی تو منی ہی سے کروں گا۔" مہا بھائی گیان چند منی کے لیگی باپ سے کہتے "سونے کی پازیب لاؤں گا۔"

"یار ملمع کی نہ ٹھوک دینا۔" یعنی بڑے بھائی گیان چند کی ساہوکاری پر حملہ کرتے ہیں۔

اور ادھر نیشنل گارڈ دیواروں پر پاکستان زندہ باد لکھ دیتے اور سیوا سنگھ کا دل اسے بگاڑ کر "اکھنڈ ہندوستان" لکھ دیتا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب پاکستان کا لین دین ایک ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ تھا۔

ابا اور روپ چند جی یہ سب کچھ سنتے اور مسکراتے اور سارے ایشیا کو ایک بنانے کے منصوبے باندھنے لگتے۔

اماں اور چاچی سیاست سے دور دھنیے ہلدی اور بیٹیوں کے جہیزوں کی باتیں کیا کرتیں اور بہوئیں ایک دوسرے کے فیشن چرانے کی تاک میں لگی رہتیں نمک مرچ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کے یہاں سے دوائیں بھی منگوائی جاتیں روز کسی کو چھینک آئی [illegible] ڈاکٹر صاحب کے پاس یا جہاں کوئی بیمار ہوا اور [illegible] نے دال بھری روٹی یا دہی بڑے بنوانے شروع کیے اور ڈاکٹر صاحب سے کہلوا دیا کہ کھانا ہو تو آ جایئے۔ اب ڈاکٹر صاحب اپنے پوتوں کا ہاتھ پکڑے آن پہنچے۔

چلتے وقت بیوی کہتیں "کھانا نہ کھانا سنا!"

"ہوں تو پھر فیس کیسے وصول کروں۔ دیکھو جی لالہ اور چھنّی کو بھیج دینا۔"

"ہائے رام تمہیں تو لاج بھی نہیں آتی" چاچی بڑبڑاتیں۔ مزہ تو جب آتا جب کبھی اماں کی طبیعت خراب ہو جاتی۔ اماں کانپ جاتیں۔

"نا بھئی میں اس مسخرے سے علاج نہیں کراؤں گی" مگر پھر گھر کے ڈاکٹر کو چھوڑ کر کون شہر سے بلانے جاتا۔ لہٰذا سنتے ہی ڈاکٹر صاحب دوڑے آتے۔

"اکیلی اکیلی پلاؤ زردے آڑاؤ گی تو آپ بیمار پڑو گی" وہ جلاتے۔

"جیسے تم کھاؤ ہو ویسے ہی اوروں کو سمجھتے ہو" اماں پردے کے پیچھے سے بھناتیں۔

"ارے یہ بیماری کا تو بہانہ ہے۔ بھابی تم ویسے ہی کہلوا دیا کرو۔ میں آجایا کروں گا۔ یہ ڈھونگ کاہے کو رچاتی ہو" وہ آنکھوں میں شرارت جمع کر کے کہتے اور اماں جل کر ہاتھ کھینچ لیتیں اور جلواتیں سناتیں۔ ابا مسکرا کر رہ جاتے۔

ایک مریض کو دیکھنے آتے تو سارے گھر کے مرض اُمڈ کھڑے ہوتے، کوئی اپنا پیٹ لیے چلا آرہا ہے تو کسی پھنسی چھل گئی۔ کسی کا کان پک رہا ہے۔ تو کسی کی ناک سوجی ہوئی ہے۔

"بس کیا مصیبت ہے ڈپٹی صاحب! ایک آدھ کو زہر دے دوں گا۔ کیا مجھے سلوتری سمجھا ہے کہ دنیا بھر کے جانور لوٹ پڑے" وہ مریضوں کو دیکھتے جاتے اور بڑبڑاتے جاتے۔

اور جہاں کوئی نئے بچے کی آمد کی اطلاع ہوتی۔ وہ جملہ سامانِ تخلیق کو گالیاں دینے لگتے۔

"ہُنہ مفت کا ڈاکٹر ہے۔ پیدا کیے جا ؤ کمبخت کے سینے پر کودو دل دلنے کے بیبے۔"

مگر جوں ہی درد شروع ہوتا وہ اپنے برآمدے سے ہمارے برآمدے کے چکر کاٹنے لگتے۔ چیخ چنگھاڑ سے سب کو بوکھلا دیتے۔ محلے ٹولے والیوں کا آنا دشوار ا بنتے والے باپ کے آتے جاتے تڑا تڑ چپتیں اور جراٰت احمقانہ پر پھٹکاریں۔

پر جوں ہی بچے کی پہلی آواز ان کے کان میں پہنچتی وہ برآمدے سے دروازے پر اور دروازے سے کمرے کے اندر آجاتے اور ان کے ساتھ ساتھ ابا بھی باولے ہو کر آجاتے۔ عورتیں کوسنی پیٹتی پردے میں ہو جائیں، زچہ کی نبض دیکھ کر وہ اس کی پیٹھ ٹھونکتے۔"واہ میری شیرنی!" اور بچے کا نال کاٹ کر نہلانا شروع کر دیتے۔ والد صاحب گھبرا گھبرا کر بھونڈی نرس کا کام انجام دینے پھر اماں چلانا شروع کر دیتیں۔

"لو غضب خدا کا۔ یہ مردوئے ہیں کہ زچا خانے میں پلے پڑتے ہیں۔"

اور معاملہ کی نزاکت کو محسوس کر کے دونوں ڈانٹ کھاتے ہوئے بچوں کی طرح بھاگتے باہر۔

اور پھر جب ابا کے اوپر فالج کا حملہ ہوا تو روپ چند جی ہاسپٹل سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور ان کی ساری پریکٹس، ان کے اور ہمارے گھر تک محدود

وہ گئی تھی۔ علاج تو اور بھی کئی ڈاکٹر کر رہے تھے مگر نرس کے اور اماں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ہی جا ئینے اور جس وقت سے وہ ابا کو دفنا کر آئے خاندانی محبت کے علاوہ انھیں ذمہ داری کا بھی احساس ہو گیا۔ بچوں کی فیس معاف کرانے، اسکول دوڑے جاتے۔ لڑکیوں بالیوں کے جہیز کے لیے گیان چند کا ناطقہ بند رکھتے۔ گھر کا کوئی خاص کام بغیر ڈاکٹر صاحب کی رائے کے نہ ہوتا۔ پچھمی بازو کو نزڈا کر جب۔ دو کمرے بڑھانے کا سوال اٹھا تو ڈاکٹر صاحب ہی کی رائے سے دبا دیا گیا۔

"اس سے تو اوپر دو کمرے بڑھوا لو" انھوں نے رائے دی اور اس پر عمل ہوا مجن الیف۔اے میں سائنس لینے کو تیار نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب جوتا لے کر پل پڑے، معاملہ طے ہو گیا۔ فریدہ میاں سے لڑ کر گھر آن بیٹھی۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس اس کا میاں پہنچا اور دوسرے دن اس کی منجھلی بہو شیلا جب بیاہ کر آئی تو دائی کا جھگڑا ابھی ختم ہو گیا۔ بیچاری ہسپتال سے بھاگی آتی۔ فیس تو دور کی چیز ہے اوپر سے چھٹے دن کرتا ٹوپی لے کر آتی۔

پر آج جب چھبا لڑ کر آئے تو ان کی ایسی آؤ بھگت ہوئی جیسے مردِ غازی میدان مار کر آیا ہے۔ سب نے ہی اس کی بہادری کی تفصیل پوچھی اور بہت سی زبانوں کے آگے صرف اماں کی زبان گنگ رہی۔ آج سے نہیں وہ پندرہ اگست سے جب ڈاکٹر صاحب نے گھر پر ترنگا جھنڈا اور اپنے گھر پر لیگ کا جھنڈا لگا تھا اسی دن سے ان کی زبان کو چپ لگ گئی تھی۔ ان دو جھنڈوں کے درمیان میلوں لمبی چوڑی خلیج حائل ہو گئی جس کی بھیانک گہرائی کو وہ اپنی غمگین آنکھوں سے

دیکھ دیکھ کر لرزا کرتیں۔ پھر سنز نار ھنبوں کا غلبہ ہوا۔ بڑی بہو کے میکے والے بھاول پور سے مال لٹا کر اور بمشکل جان بچا کر جب آئے تو خلیج کا دہانہ چوڑا ہوگیا۔ پھر راول پنڈی سے جب نرملا کے سسرال والے نیم مردہ حالت میں آئے تو اس خلیج میں اژدھے پھنکاریں مارنے لگے جب چھوٹی بھابی نے اپنے بچے کا پیٹ دکھانے کو بھیجا تو شیلا بھابی نے جلدی سے نوکر کو بھگا دیا۔

اور کسی نے بھی اس معاملے پر بحث مباحثہ نہیں کیا۔ سارے گھر کے مریض ایک دم رُک گئے۔ بڑی بھابی تو اپنے ہسٹیریا کے دورے بھول کر لپا جھپ اسباب باندھنے لگیں۔

"میرے ٹرنک کو ہاتھ نہ لگانا"۔ اماں کی زبان آخر کو کھلی اور سب ہکا بکا رہ گئے۔

"کیا آپ نہیں جائیں گی"۔ بڑے بھتیا ترشی سے بولے۔

"تو جو موئی میں سندھنوں میں مرنے جاؤں۔ اللہ ماریاں۔ بڑے کے پاجامے پھڑکاتی پھرتی ہیں"۔

"تو سنجلے کے پاس ڈھاکہ چلی جایئے"۔

"اے وہ ڈھاکہ کاہے کو جائیں گی۔ کہیں کی موئی کاٹے بنگالی تو چاول ہاتھوں سے لسیڑ لسیڑ کے کھاتے ہیں"۔ سنجھلے کی ساس ممانی بی نے طعنہ دیا۔

"تو راولپنڈی چلو فریدہ کے یہاں" خالہ بولیں۔

"توبہ میری، اللہ پاک پنجابیوں کے ہاتھوں کسی کی مٹی پلید نہ کرائے مٹ گئی دوزخیوں کی تو زبان بولتے ہیں۔" آج تو میری کم سخن اماں پٹاپٹ بول

چلیں:۔

"اے بوا تمہاری تو وہی مثل ہو گئی کہ اونچے کے نیچے بھیڑیئے کے پیڑ تلے بیٹھی تیرا گھر نہ جانو۔ اے بی یہ کٹو گلہری کی طرح غمزہ سنیاں کہ بادشاہ نے بلایا۔ لو بھئی چھم چھم کرتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاتھی بھیجا کہ چک چک یہ تو کالا کالا کہ گھوڑا بھیجا چک چک یہ تو لاتیں جھاڑے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

باوجود کہ فضا مکدر سی تھی پھر بھی قہقہہ پڑ گیا۔ میری اماں کا منہ اور پھول گیا۔

"کیا بچوں کی سی باتیں ہو رہی ہیں" نیشنل گارڈ کے سردار اعلیٰ بولے "جن کا سر نہ پیر۔ کیا ارادہ ہے۔ یہاں رہ کر کٹ مریں؟"

"تم لوگ جاؤ، اب میں کہاں جاؤں گی۔ میرا آخری وقت۔"

"تو آخری وقت میں کافروں سے گت بنواؤ گی؟" خالہ بی پوٹلیاں گنی جاتی ہیں اور پوٹلیوں میں سے سونے چاندی کے زیور سے لے کر ہڑیوں کا منجن، سوکھی میتھی اور ملتانی مٹی تک تھی۔ ان چیزوں کو وہ ایسے کلیجے سے لگا کر لے جا رہی تھیں گویا پاکستان کا اسٹرلنگ بیلنس کم ہو جائے گا۔ تین دفعہ بڑے بھائی نے جل کر ان کی پرانے روہڑ کی پوٹلیاں پھینکیں پر وہ ایسی چنگھاڑیں گویا یہ دولت نہ گئی تو پاکستان غریب رہ جائے گا اور مجبوراً بچوں کے موت میں ڈوبی ہوئی گدڑیوں کی روئی کے پلندے باندھنے پڑے۔ برتن بوروں میں بھرے گئے۔ پلنگوں کی پائے پٹیاں کھول کر جھلنگوں میں باندھی گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے جما جمایا گھر ٹیڑھی میڑھی گٹھڑیوں اور بقچوں میں تبدیل ہو گیا

اب تو سامان کے پیر لگ گئے ہیں اور زلا پنجیں بھرتا پھرتا ہے۔ ذرا سستانے کو بیٹھا ہے اور پھر اٹھ کر ناچنے لگے گا۔

پر اماں کا ٹرنک جوں کا توں رکھا رہا۔

"آپ کا ارادہ یہاں مرنے کا ہے تو کون روک سکتا ہے"۔ بھائی صاحب نے آخر میں کہا۔

اور میری معصوم صورت کی بھولی سی اماں بھٹکتی آنکھوں سے گدلے آسمان کو تکتی رہیں، جیسے وہ خود اپنے آپ سے پوچھتی ہوں کون مار ڈالے گا؟ اور کب؟

"اماں تو سٹھیا گئی ہیں۔ اس عمر میں عقل ٹھکانے نہیں"۔ منجھلے بھائی کان میں کھسپسائے۔

"کیا معلوم انہیں کہ کافروں نے معصوموں پر تو اور ظلم ڈھائے ہیں۔ اپنا وطن ہو گا نوجوان وہاں کا تو اطمینان رہے گا"۔

اگر میری کم سخن اماں کی زبان تیز ہوتی تو وہ ضرور کہتیں "اپنا وطن ہے کس چڑیا کا نام؟ لوگو! بتاؤ تو وہ ہے کہاں اپنا وطن، جس مٹی میں جنم لیا جس میں لوٹ پوٹ کر بڑھے پلے، وہی اپنا وطن نہ ہوا تو پھر جہاں چار دن کو جا کر بس جاؤ وہ کیسے اپنا وطن ہو جائے گا اور پھر کون جانے وہاں سے بھی کوئی نکال دے۔ کہے جاؤ نیا وطن بساؤ۔ اب یہاں چراغِ سحری بنی بیٹھی ہوں، ایک ننھا سا جھونکا آیا اور وطن کا جھگڑا ختم اور یہ وطن اجاڑنے اور بسانے کا کھیل کچھ دلچسپی بھی تو نہیں ایک دن تھا مغل اپنا وطن چھوڑ کر نیا وطن بسانے آئے تھے۔ آج پھر چلو

وطن لیا نے وطن نہ ہوا پیر کی جوتی ہو گئی، ذرا تنگ پڑی اتار پھینکی، دوسری پہن لی، مگر وہ خاموش رہیں اور ان کا چہرہ پہلے سے زیادہ تھکا ہوا معلوم ہونے لگا جیسے وہ صدیوں سے وطن کی کھوج میں خاک چھاننے کے بعد تھک کر آن بیٹھی ہوں اور اس تلاش میں خود کو بھی کھو چکی ہوں۔

سر آئے پھیر گئے۔ مگر اماں اپنی جگہ پر ایسے جمی رہیں جیسے برگد کے پیڑ کی جڑ آندھی طوفان میں کھڑی رہتی ہے۔

پر جب بیٹے بیٹیاں بہوئیں، داماد، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں پورا کا پورا قافلہ بڑے پھاٹک سے نکل کر پولیس کی نگرانی میں لاریوں میں سوار ہونے لگا تو ان کے کلیجے کے ٹکڑے اڑنے لگے۔ بے چین نظروں سے انہوں نے خلیج کے اس پار بیکسی سے دیکھا۔ سڑک بیچ کا گھر اتنا دور لگا جیسے دور آفق پر کوئی سرگرداں بادل کا ٹکڑا۔ روپ چندجی کا برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ دو ایک بار بچے باہر نکلے مگر ہاتھ پکڑ کر واپس گھسیٹ لیے گئے۔ پر اماں کی آنسو بھری آنکھوں نے ان آنکھوں کو دیکھ لیا جو دروازوں کی جھریوں اور چقوں کے پیچھے نمناک ہو رہی تھیں۔ جب لاریاں دھول اڑا کر قافلے کو لے سدھاریں تو ایک بائیں طرف کی مردہ حس نے سانس لی، دروازہ کھلا اور بوجھل قدموں سے روپ چندجی چوروں کی طرح سامنے کے خالی ڈھنڈھار گھر کو تکتے نکلے اور تھوڑی دیر تک غبار کے بگولے میں لپٹی ہوئی صورتوں کو ڈھونڈھتے رہے اور پھر ان کی ناکام نگاہیں مجرمانہ انداز میں، اجڑے دیار میں بھٹکتی ہوئی واپس زمین میں دھنس گئیں۔

وہ جو اپنے پیاروں کی گود میں سدھار ــــ ت پر زندگی کی ساتھی کو چھوڑ گئے جو آج بے کفنائی ہوئی لاش کی طرح لاوارث پڑی رہ گئی۔ پیروں نے جواب دے دیا اور وہیں بیٹھ گئیں جہاں میت کے سرہانے دس برس ان کپکپاتے ہاتھوں نے چراغ جلایا تھا۔ پر آج چراغ میں تیل نہ تھا اور بتی بھی ختم ہو چکی تھی۔

اور سامنے روپ چند اپنے برآمدے میں زور زور سے ٹہل رہے تھے۔ گالیاں دے رہے تھے۔ اپنے بیوی بچوں کو، نوکروں کو سرکار کو اور سامنے پھیلی ہوئی بے زبان سڑک کو، اینٹ پتھر کو اور چاقو چھری کو، حتیٰ کہ پوری کائنات ان کی گالیوں کی بمباری کے آگے سہمی دبکی بیٹھی تھی اور خاص طور پر اس سب خالی گھر کو جو سڑک کے اس پار کھڑا ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ جیسے خود انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی اینٹ سے اینٹ ٹکرا دی ہو، وہ کوئی چیز اپنے دماغ میں سے جھٹک دینا چاہتے تھے۔ ساری قوتوں کی مدد سے نوچ کر پھینک دینا چاہتے تھے مگر ناکام سے جھنجھلا اٹھتے تھے۔ کینہ کی جڑوں کی طرح جو چیز ان کے وجود میں جم چکی تھی وہ اسے پوری طاقت سے کھینچ رہے تھے مگر ساتھ ساتھ جیسے ان کا گوشت کھنچا چلا آتا ہو، وہ کراہ کر چھوڑ دیتے تھے پھر ایک دم ان کی گالیاں بند ہو گئیں، ٹہل تھم گئی اور وہ موٹر میں بیٹھ کر چل دیئے۔

رات کو جب گلی کے نکڑ پر سناٹا چھا گیا تو پچھلے دروازے سے روپ چند کی بیوی، دو پڑوسی ہوئی تھالیاں اوپر نیچے دھرے چوروں کی طرح داخل ہوئیں۔ دونوں بوڑھی عورتیں خاموش ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ زبانیں بند رہیں پر آنکھیں سب کچھ کہہ سن رہی تھیں۔ دونوں تھالیوں کا کھانا جوں کا توں

جب ساری عمر کی پونجی کو خدا کے رحم و کرم کے حوالے کر کے اماں ڈھنڈھار صحن میں آکر کھڑی ہوئیں تو ان کا بوڑھا دل ننھے بچے کی طرح سہم کر کھلا گیا جیسے چاروں طرف سے بھوت آن کر انہیں دبوچ لیں گے۔ چکرا کر انہوں نے کھبے کا سہارا لیا۔ سامنے نظر اٹھی تو کلیجہ اچھل کر منہ کو آیا یہی تو وہ کمرہ تھا جسے دولہا کی پیار بھری گود میں لانگ کر آئی تھیں۔ یہیں تو کمسن خوفزدہ آنکھوں والی بھولی سی دلہن کے چاند سے چہرے پر سے گھونگھٹ اٹھا۔ زندگی بھر کی غلامی لکھدی تھی۔ وہ سامنے بازو کے کمرے میں پہلوٹھی کی بیٹی پیدا ہوئی تھی اور بڑی بیٹی کی یاد ایک دم سے ہوک بن کر کلیجے میں کوند گئی۔ وہ کونے میں اس کا نال گڑا تھا۔ ایک نہیں دس نال گڑے تھے اور دس روحوں نے یہیں پہلی سانس لی تھی۔ دس گوشت و پوست کی مورتیوں نے، دس انسانوں نے اسی مقدس کمرے میں جنم لیا تھا۔ اس مقدس کوکھ سے جیسے آج وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے جیسے وہ پرانی کیچلی تھی جسے کانٹوں میں الجھا کر وہ سب شاسٹ نکلے چلے گئے۔ امن اور سکون کی تلاش میں۔ روپیہ کے ۴ سیر گیہوں کے پیچھے اور وہ ننھی ننھی معصوموں کی پیاری آغوں آغوں سے کمرہ اب تک گونج رہا تھا۔ لپک کر وہ کمرے میں گود پھیلا کر دوڑ گئیں، پھر ان کی گود خالی تھی وہ گود جسے سہاگنیں تقدس سے چھو کر ہاتھ کوکھ کو لگاتی تھیں، آج خالی تھی۔ کمرہ پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ دہشت زدہ ہو کر وہ لوٹ پڑیں مگر چھوٹے ہوئے تخیل کے قدم نہ لوٹا سکیں۔ وہ دوسرے کمرے میں لڑکھڑا گئیں یہیں تو زندگی کے ساتھی نے پچاس برس کے نباہ کے بعد منہ موڑا تھا یہیں دروازے کے سامنے کفنائی ہوئی لاش رکھی تھی۔ سارا کنبہ گھیرے کھڑا تھا۔ خوش نصیب تھے

رکھا تھا۔ نہیں جب کسی کی غیبت کرتی ہیں تو ان کی زبانیں کترنی کی طرح چل نکلتی ہیں۔ پر جہاں جذبات نے حملہ کیا اور منہ میں تالے پڑ گئے۔

رات بھر نہ جانے کتنی دیر پریشانیاں اکیلا پا کر شبخون مارتی ہیں۔ نہ جانے راستے ہی میں تو سب نہ ختم ہو جائیں گے۔ آج کل تو اکا دکا نہیں پوری پوری ریلیں کٹ رہی ہیں۔ پچاس برس خون سے سینچ کر کھیتی تیار کی اور آج وہ دلیس نکالا دے کر نئی زمین کی تلاش میں افتاں و خیزاں چل پڑی تھی۔ کون جانے نئی زمین ان پودوں کو راس آئے نہ آئے۔ کھلا تو نہ جائیں گے۔ یہ غریب الوطن پودے! چھوٹی بہو تو اللہ رکھے ان گنا مہینہ ہے۔ نہ جانے کس جنگل میں زچہ خانہ بنے۔ گھر بار نوکری، بیوپار سب کچھ چھوڑ کر چل پڑے ہیں۔ نئے وطن میں چیل کوؤں نے کچھ چھوڑا بھی ہوگا یا یہ منہ تکتے ہی لوٹ آئیں گے اور جو لوٹ کر آئیں گے اور جو لوٹ کر آئے تو پھر سے جڑیں پکڑنے کا بھی موقع ملے گا یا نہیں۔ کون جانے یہ بوڑھا ٹھونٹ بہار کے لوٹ آنے تک زندہ بھی رہے گا کہ نہیں۔

گھنٹوں سڑن بادلیوں کی طرح دیوار پاکھوں سے لپٹ لپٹ کر نہ جانے کیا بکتی رہیں پھر شل ہو کر پڑ گئیں۔ نیند کہاں؟ ساری رات بوڑھا جسم جوان بیٹیوں کی کٹی پھٹی لاشیں، نوعمر بہوؤں کے برہنہ جلوس اور پوتوں نواسوں کے جھنجھیڑے اڑتے دیکھ دیکھ کر تھراتا رہا۔ نہ جانے کب غفلت نے حملہ کر دیا۔

کہ ایک دم ایسا معلوم ہوا دروازے پر دنیا بھر کا غدر ڈھے پڑا ہے۔ جان پیاری نہ سہی پر بنا تیل کا دیا بھی بجھتے وقت کانپ تو اٹھتا ہی ہے اور پھر سیدھی

ساری موت ہی کیا بے رحم ہوتی ہے جو اوپر سے وہ انسان کا بھوت بن کر کے۔ سنا ہے بڑھیوں تک کو بال پکڑ کر سڑکوں پر گھسیٹتے ہیں۔ یہاں تک کہ کھال چھل کر ہڈیاں جھلک آتی ہیں اور پھر وہیں دنیا کے وہ عذاب نازل ہوتے ہیں جن کے خیال سے دوزخ کے فرشتے بھی زرد پڑ جائیں۔

دستک کی گھن گرج بڑھتی جا رہی تھی۔ ملک الموت کو جلدی پڑی تھی نا اور پھر آپ سے آپ ساری چٹخنیاں کھل گئیں۔ بتیاں جل اٹھیں جیسے دور کنوئیں کی تہ سے کسی کی آواز آئی۔ شاید بڑا لڑکا پکار رہا تھا۔ نہیں یہ تو چھوٹے اور سنجھلے کی آواز تھی۔ دوسری دنیا کے معدوم سے کونے سے۔

تو مل گیا سب کو دلّن؟ اتنی جلدی؟ سنجھلا، اس کے پیچھے چھوٹا۔ صاف تو کھڑے تھے، گودوں میں بچوں کو اٹھائے بہوئیں۔ پھر ایک دم سے سارا گھر جی اٹھا۔ ساری روحیں جاگ اٹھیں اور دکھیاری ماں کے گرد جمع ہو گئیں چھوٹے بڑے ہاتھ پیار سے چھونے لگے۔ ایک دم سے خشک ہونٹ میں ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ نکلیں، وفورِ مسرت سے سارے حواس تتر بتر ہو کر تاریکی میں بھنور ڈالتے ڈوب گئے۔

جب آنکھ کھلی تو نبض پر جانی پہچانی انگلیاں رینگ رہی تھیں۔

"ارے بھابی مجھے ویسے ہی بلا لیا کرو چلا آؤں گا۔ یہ ڈھونگ کاہے کو رچاتی ہو؟" روپ چند جی پردے کے پیچھے سے کہہ رہے تھے۔

"اور بھابی آج تو فیس دلوا دو، دیکھو تمہارے نالائق لڑکوں کو تو نئی جکشن سے پکڑ کر لایا ہوں۔ بھاگے جاتے تھے بدمعاش کہیں کے۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ

کا بھی اعتبار نہیں کرتے تھے؟

پھر بوڑھے ہونٹ میں کونپلیں پھوٹ نکلیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر دو گرم گرم موتی لڑھک کر زرد پچندجی کے جھریوں وار ہاتھ پر گر پڑے۔

مجھے معلوم تھا. وہ سوبنا سو طوائف ہیں. وہ سرخ مصنوعی بال، چست کپڑے اور
ن رات مردوں نے ٹھٹ. ناچ گانے اور سوٹے مہین قہقہے. مجھے اپنے کمرے
ں بیٹھے بٹھائے جھکولا کرتے تھے. ہم عورتیں بڑے سے بڑے پہلوانوں کو جیت
سکتی ہیں پر جب طوائف سے ٹکر ہوتی ہے تو ساری نسوانیت اپنا سامنہ لے کر رہ
تی. یہی وجہ ہے کہ ماں لوری کے ساتھ ساتھ بچے کے دل میں یہ بات چپکا دیتی ہے
طوائف اژدہا ہے. سانپ ہے، اکیا کچھ ہے.

اور یہی بچپن کی نفرت اب تک خون کے ذروں میں ناچ رہی ہے. ویسے
ارور عورتیں گزر جائیں. پتہ نہیں چلتا. لیکن طوائف کو سونگھ کر ہرن کی طرح بھڑک
تی ہوں. مجھے یاد ہے کہ یہ خوشبو پہلی دفعہ میں نے بہت بچپن میں سونگھی تھی بھرا لگے
سید میاں کے مزار پر جمعرات کو طوائفوں کا جمگھٹا ہوتا. اللہ کے پیارے بھی
متبرک دن کچھ زیادہ ہی آجاتے، ایک دن ایک پکی سی طوائف نے مجھے نہ جانے

کس جذبہ کے تحت گود میں اٹھا لیا۔ وہ اس کے پھسلنے کپڑے اور مخصوص خوشبو میں بسا ہوا سینہ! میں جلدی سے اس کی گود سے مچل آئی۔

اس دن مجھے سب نے خوب تھو تھو کرکے چھیڑا کہ ہے۔ بچاری کو زندگی نے چھو لیا اور میں بھی اس ننگ کے احساس سے دیر تک روتی رہی پھر ایک دن میری پھوپھی آئیں اور انہوں نے مجھے پیار کیا تو وہی پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے اور جھکتا ہوا سینہ! نہ جانے کیوں میں خود اُ مچل کر بھاگ آئی میرا اندازہ ٹھیک نکلا اور میری رنگین پھوپھی مشکل سے مہینہ بھر رہی ہوں گی کہ دس بجوں تک اب میرے ابا جان ان پر بڑی طرح عاشق ہو گئے۔ میری اماں بچاری بجھ کر رہ گئیں۔ بھلا پان بیڑی کی دکان کے سامنے کوئی شاندار ہوٹل کھول دے تو بچاری دکان کا جو بنے کے دن کا! خیر ٹونے ٹوٹکے ہوئے، تب جا کر کہیں ان کے گردوں میں درد اٹھا اور وہ بھاگیں ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ ہم عورتیں طوائفوں کو سونگھ کر رہی کھٹک جاتی ہیں۔ بقول کسے ان کا ٹھسا دیکھ کر ہی حفاظتی دیواریں کھڑی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ کوٹھے سے اتر رہی تھیں اور میں پڑھ رہی تھی کہ میں نے انہیں سونگھ لیا۔ اے ہے یہ میں کہاں آگئی؟ کیے گی دنیا؟ میرے محلہ والے کیا کہیں گے؟ ایک سے ایک بد مزاج بھرا پڑا ہے محلہ والیوں سے زیادہ یہ محلہ والے ایسی ویسی باتوں پیچھے لگے رہتے ہیں۔

عید کا دن تھا۔ غریبی میں کیسی عید اور کیسا محرم، کپڑے بھی نہ بدلے اپنی اخبار دیکھتی رہی۔ پڑوسن کے یہاں چار بجے سے برتن کھڑک رہے تھے ان بچاریوں کو نیاز نذر کی بڑی فکر پڑی رہتی۔ بستر پر لیٹی ناشتہ کر رہی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹایا اور اور قبل اس کے کہ میں سنبھلوں وہ آن دھمکیں!

عام طور پر کیسے معلوم رہتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے اور میری عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی طوائف دندناتی چلی آئی ہو۔ لہٰذا میں گھبرا کر رہ گئی۔

"اے ہے میں نے کہا کہیں تم ناشتہ نہ کر چکو۔ کیا لشتم پشتم سویاں بگھاری ہیں"۔۔۔ وہ اپنے چست کپڑوں میں سے چھنکاریں۔ کمبخت کو یہ بھی سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ تنگ کپڑے پہننے کے دن کبھی کے جا چکے تھے اور نمیری کانٹے کوتموں سے کسنے سے نہایت ناہموار سطح ہو جاتی ہے۔

میں صبح کے وقت مٹھاس نہیں کھاتی۔۔۔ میں نے غرور سے گرہستن بننے کی کوشش کی۔

"اوئی آج عید کے دن بھی مٹھاس نہیں۔۔۔ بھئی تمہیں ہماری قسم تھوڑی سی ضرور چکھو۔۔" وہ نہایت بے تکلفی سے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

یا اللہ! کیا یہ مجھے بھی طوائف سمجھ کر تبرک کے ذریعہ میرے گناہ دھوتے ئی تھیں۔ اب یہ کیسے بتاؤں کہ میں قطعی نیک اور پارسا ہوں اور پھر قسم! اوہ معبود وہی تو اس کے ہزاروں عاشقوں کی جھوٹی ہوئی۔ قسم تھی جو یہ میرے حلق میں ٹھونس رہی تھی! میں جل اٹھی لیکن جب وہ بے حیائی سے مصر ہی ہوگئیں تو میں نے دو چمچے چکھ لیے۔

"باورچی نے کہا کہ یہ بیوی مسلمان ہیں۔۔۔ بس میرا جی ملنے کو پھڑک رہا تھا مگر تو سارا دن غائب رہتی ہو۔۔۔" کسی نے انہیں پکارا اور وہ چلی گئیں۔

میں نے دو چمچے اور کھائے! یا خدایا جی چاہا حلق میں انگلی ڈال کر سب دوں۔ یہ مجھے کیا ہوگیا تھا۔ میں طوائف کی کمائی کھا رہی تھی۔ عصمت فروشی کی جمع

کی ہوئی گھناؤنی دولت۔ فاحشہ بدکار کا پیشہ ؟

مگر پھر میرے دل میں نہایت بے شرمی کے باغیانہ خیالات ناچنے لگے۔ ی
رنڈی کا پیشہ بھی تو اپنے باپ دادا ہی کا پیشہ ہے۔ میرے ایک چچا تھے جنھو
نے تین ہفتہ میں تیس ہزار روپیہ رنڈی بازی میں اڑا دیا تھا۔ اس سے مجھے کیا ک
میری چچی رنڈی کون تھی۔ ان کالی بالوں والی ہی کی کوئی بہن بھانجی ہو گی میں نے
اور شوق سے سویاں کھانی شروع کیں۔ جیسے میں پھینکا ہوا مال سمیٹ رہی تھی۔ مجھے ا
قسم کا اطمینان سا مل رہا تھا۔ میں ایک امیر کو کچھ تھوڑا سا غریب بنا رہی تھی۔ ایک چمچ
اور لیا اور میرا منہ کیوڑہ اور میوہ میں گھلی ہوئی سویاں سے بھر گیا ایک بڑا سا
پستہ میری داڑھ کے نیچے پچ سے آ گیا۔ چکنائی کی ننھی ننھی بوندیں منہ بھید کنے لگیں
جیسے میں نے کسی موٹے سے بنیئے کو چبا ڈالا۔ مگر فوراً ہی مجھے اس کی چربی کے
خیال سے ابکائی آ گئی۔ مجھے وہی اطمینان محسوس ہو رہا تھا جو انگریزی کپڑے
جلاتے وقت بلوائیوں کو ہوتا ہے۔ ہماری انتقام پسند آنکھیں ان خالی خولی کپڑو
میں اپنی مرضی کے موافق تخیلی جسم دیکھ کر سکون محسوس کرتی ہیں۔

میں نے سرہانے کی میز سے میٹرک کے امتحان کی کاپیاں اٹھا کر دیکھنا شر
کیں۔ کیسی عید اور کیسی بقر عید ابھی تین سو کاپیاں اور دیکھنا تھیں مگر میرا دماغ
بھنکنا شروع کر دیتا ہے۔ تو ہزار گھبر دں پکڑ میں نہیں آتا، جل کر میں نے کئی بد قسمتو
فیل کر دیا۔ پھر کاپیاں دور پھینک کر انگڑائیاں لینے لگی۔ یہ یہاں کی آب و ہوا بھی
عجیب ہے۔ جیسے بڑے سے گیلے تولیہ میں فضا لپٹی اونگھ رہی ہے۔ تھکی تھکی بو
اعضا بھاری اور پھیلے جیسے کسی نے سریش لگا کر ہلکا سا سکھا دیا ہو۔ ایک جھلایا ہوا اسر

اور پھر پڑوسن کے یہاں سے قہقہوں کے گرم گرم بھپکے!

بدنصیب! مجھے پڑوسن پر رحم آنے لگا۔ ممکن ہے۔ غریب اپنا جوہرِ عصمت لٹانے پر مجبور ہو گئی ہو۔ شاید کسی ظالم نے اس کی عزت لوٹ لی ہو اور پھر وہ کھسیا کر سرِ بازار بکھیرنے لگی اور مجھے اس پر پیار آ گیا جب کبھی ہم سب بچے اماں سے کوئی کھانے پینے کی چیز چھیننے لگتے تو وہ بھی کھسیا کر ٹوکرے کا ٹوکرا پٹخ دیتی تھیں۔ کہ "لو نامرادو بھگتو۔ آپ مر گئے ۔۔۔!"

لیکن ہمیشہ نیک خیال کے ساتھ بدخیال ضرور میرے دماغ میں رینگ آیا کرتا ہے اور جونہی بیچارا نیک خیال اونگھا بد نے پھن اٹھایا۔ یقیناً یہ سرخ بالوں والی طوائف تو جان بوجھ کر شوقیہ بنی ہوگی۔ سستی کے مارے اور دنیا کا کچھ کام نہ ہو سکا۔ مزے سے یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ ہاں اور کیا؟ بھلا پڑوسن سے کیا سلائی ہوتی یا چکی پستی۔ سو جھیلے ہیں۔ دنیا کے اور پیشوں میں۔ میاں بیوی بچے ساس نند کی تو تو میں میں بھلا کون بھگتے ۔۔۔ بھلا یہ جوبن قائم رہتا جو پڑوسن کے بھی دو چار ساس نندیں ہوتیں ۔۔۔ توبہ کیجئے!

ایک دن جیسے ہی فلیٹ پر پہنچی۔ پڑوسن کے یہاں کسی کے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ سارے دن کی تھکن اس پر گھڑی بھر کو چین نہیں اسکول سے آکر جب تھک کر گھنٹے مردے کی طرح نہ پڑے رہو۔ تھکی نہیں۔ اترتی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کلاس میں لڑکیاں نے بھیجے کو گنے کی گنڈیری کی طرح مزے لے لے کر چبایا اور تھوک دیا۔ بڑی مشکلوں سے اس چوسی ہوئی گنڈیری کو تازہ کیجئے۔ صبح پھر وہ نکیلے دانتوں کے گھسے! سال میں ۲۶۰ دن یہی عمل جاری رکھے۔ اس کے بعد ۔۔۔ اس کے بعد پھر وہی چوسی ہوئی گنڈیری

کا پھوگ۔

دروازہ کھلا اور وہ ایڑیاں ٹھمکاتی چلی آئیں۔ آتے ہی گرجیں۔

"میں تو عاجز آ گئی ہوں نگار سے ۔۔۔ اللہ جانتا ہے، انہیں بھی کیا سکول کی پڑھائی کہ ناس لگ گیا۔"

ہوا تو گویا رنڈیوں کی لڑکیوں کے بھی اس قدر ذی حس ہوتے ہیں کہ مرسکیں خوب تو آپ بھی چلیں اعتراض کرنے!

"کیوں بھیجتی ہیں اسکول ۔۔۔ اٹھا لیجیے۔"

"اوئی اٹھالوں؟ ۔۔ لو اور سنو ۔۔۔ اے بی آجکل بے پڑھی لکھی کو کون پوچھتا ہے ۔۔۔ آجکل تو بس گٹ مٹ کرتی میم چاہیئے۔"

یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ اس پیشے میں بھی تعلیم یافتہ ہونے کی ضرورت ہے۔ شیکسپیر اور ورڈس ورتھ کے حوالوں کی بھی ضرورتیں آتی ہیں!

"بات کیا ہوئی؟"

"اے وہ میں نے کہا بیٹی نگار آج کھڑا پاجامہ پہن لو۔ کہ نہیں ۔۔ جو بات ہے نہیں ۔۔ بس وہ موئی فراخیں چڑھا لو ۔۔۔ میں نے کہا تم سمجھاؤ تو شاید مان جائے۔ بات یہ ہے کہ کچھ لوگ دلی سے آ رہے ہیں ۔۔" انہوں نے رازدارانہ انداز میں کہا اور میرا جی چاہا ان کا چقندر جیسا منہ کھسوٹ لوں، اجی؟ یعنی میں سمجھاؤں؟ خوب تو گویا مجھے بی۔ٹی میں رنڈیوں کی لڑکیوں کو پیشہ کے ہتھکنڈے ہی سکھائے گئے تھے۔ اب بھلا بتائیے یہ کیسے سکھاؤں کہ بھئی دلّی والوں کے لیے پاجامہ پہنو، کلکتہ والوں کے ساڑھی اور لاہور والے شلوار پسند کرتے ہیں خوب! اور دوسرے مجھے یہ نگار مانتی ہے

سے بری لگتی تھی۔ یعنی یہ کیا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد یا فساد کا نمونہ ہے یا کیا؟ بڑے۔ بڑے بڑے لیڈر جیت ہو گئے اور یہاں تک محترمہ کی جدت پسندی نے ہندو مسلم سب کو گڈ مڈ کر کے رکھ دیا۔ مگر یہ میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ ہر شخص کو مجبور سمجھ لیتی ہوں۔ شاید لال بالوں والی سیٹھانی بھی مجبور ہی ہو گئی ہوں، گڑبڑ میں یاد نہ رہا ہو اور بجائے کسی کی حق تلفی کرنے کے انہوں نے دونوں ہی کا خیال رکھا۔ خیر!

"تم کبھی ہماری طرف نہیں آتیں۔" انہوں نے ڈھٹائی سے کہا۔ قبل اس کے کہ میں روکھا جواب دوں بولیں، "انگارے نے تو ڑے سیکھے ہیں۔"

"اگر مجھے کسی وقت رنڈی پر پیار آتا ہے تو اس وقت جب کہ وہ ناچ رہی ہو اس وقت وہ مجھے عین میں اس محنتی مزدور کی طرح معلوم ہوتی ہے جو پیٹ کی خاطر سرمایہ داری کے کولہو میں بیل کی طرح جتا ہوا ہو یا جیسے دس سیر اناج پیس لیا ہو۔ مگر مجھے طوائف کی زندگی کے دوسرے رخ سے گھن اس لئے نہیں کہ وہ کچھ مختلف ہے۔ بالکل نہیں — بلکہ — یا کچھ ضرورت سے زیادہ مشکل ہے — یہ بات نہیں — بلکہ یونہی۔

دوسرے دن ہمت کر کے میں سیٹھانی کے فلیٹ میں چلی ہی گئی کہ دیکھوں اندر سے ان لوگوں کے گھر کیسے ہوتے ہیں، اف وہ بس یہ سمجھ لیجئے کسی چھوٹے موٹے راجہ یا وزیر کا گھر — قد آدم تصویریں — برہنہ عورتوں کے مجسمے۔ یہ طوائفیں ننگی عورتوں کی تصویریں بھلا کیوں اپنے گھر میں رکھتی ہیں۔ بھلا اس سے کیا فائدہ سمجھاتی تو شاید اپنے جسم کی بھیانک سلوٹوں کو ان سڈول مجسموں کی آڑ میں دکھانا چاہتی ہے۔ ہو گا کوئی گران لوگوں کا!

ہوکھا نا چاہتی ہے۔ ہوگا کرئی گران لوگوں کا!

نگار مجھے دیکھ کر ایسے شرمائی۔ گویا انڈا کھٹک کر باہر نکلی ہے اور بڑی دیر یمک نخرے کرنے کے بعد آئی۔ سیٹھانی نے ڈانٹا تو خیر ریکارڈ لگا کر ناچنے لگی۔ یہ زنڈیاں! اُف میں نے تو سنا تھا کہ ان کے جسموں کو گھن لگ جاتا ہے۔ مگر سیٹھانی تو لوہے کی لاٹھ دکھی تھیں اور اولاد تو خدا کی پناہ ۔ کیا پھرتیلا لوچدار جسم، جیسے ناگن انگڑائیاں لے رہی ہے۔ جب کلائی پر کلائی کی گرہ باندھ کر وہ پنجوں سے توڑے لیتی تو اس کی ننھی ننھی ٹھوکروں سے ساری دنیا ملکورے لینے لگتی میرا دل لرزاتا تھا۔ اف یہ ناگن نہ جانے کتنے ننکار تھیلے میں ٹھونسے گی، ویسے تو عورت دوسری عورت سے وقت بے وقت جل ہی جاتی ہے۔ مگر طوائف سے تو خدا کی پناہ ۔ ! عورت تو اپنا حصّہ یعنی ایک مرد لے کر بازار سے ہٹ جاتی ہے۔ مگر طوائف سے تو چھٹکارا نہیں جیسے دکان سے اناج لیتے وقت عوام تو حسب ضرورت لے کر ہٹ جاتے ہیں۔ مگر خاص لوگ بھر بھر بورے تہ خانوں کے پیچھے میں اتار دیتے ہیں نتیجہ ؟ ۔ اگر اکنومکس پڑھی ہے تو بس سمجھ لیجئے اناج کی کمی! تو یہ ہماری جنگ جو طوائفوں سے چلی آرہی ہے۔ یہ بھی مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ ہے۔ دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوے میوہ کھائیں کہتے ہیں۔ ایک دن ایسا دکھتا ہوا آئے گا کہ سارے مزدور سرمایہ داروں کو پیس کر پھینک دیں گے اور ان کا سارا سرمایہ چھین لیں گے۔ شاید عورتیں بھی اسی طرح حملہ کر کے ایک دن طوائفوں کا "سرمایہ" چھین لیں! شاید!

۔۔ شام ہوئی تو گاہک آنے لگے ۔ مارے شرم کے میں سکڑی ایک طرف کو بیٹھی

رہی کہ موقع ملے تو اڑ دوں کہیں مجھے بھی ان میں سے ایک نہ سمجھ لیں اور یہی ہوا کہ ایک بجھے ہوئے سے ایڈیٹر صاحب انہوں نے میرے سر چپکا دیئے کمبخت میں کچھ بول بھی نہ سکی اور اس نے میرا سودا بھی کر دیا۔

تھوڑی سی دیر میں پورا ہال بھر گیا ـــــ رنگین عورتیں اور عیاش مرد دندند کے قہقہے چلنے لگے۔ ایک کونے میں چار چھ نے بیٹھ کر پینا اور جوا شروع کر دیا دوسری طرف نگار گھیرے میں ادھر سے ادھر چہک رہی تھی۔ اس پر لوگوں کی خاص توجہ تھی۔ ایک ادھیڑ سا مرد تو اسے گود میں گھسیٹے لیتا تھا اور وہ ہنس ہنس کر انہیں مار رہی تھی۔

مگر سماں تو سیٹھانی نے باندھ رکھا تھا۔ گہرے رنگ کے بھڑکدار کپڑے جو دن کو بے تکے لگ رہے تھے۔ اس وقت بہار دے رہے تھے۔ پاؤڈر سرخی سے کیس جیسی جچ تھی کہ دلہن دو چار کمسن لڑکوں میں گھری ہوئی نازک چہلیں کر رہی تھیں۔ اس وقت بلا کی کم سن اور حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ میں حیران بیٹھی تھی کہ جوانی عمر سے ہوتی ہے۔ یا اداؤں سے اور ادھر وہ ایڈیٹر صاحب بیٹھے مجھے چبا رہے تھے۔ انتہائی ترقی پسندانہ باتیں اور اس خوبصورتی سے کہ میں ہکلا ہکلا کے رہ جاؤں۔ ان کی پوری توجہ ان برہنہ تصویروں کی طرف تھی جو میرے بہت ہی قریب ٹنگی تھیں بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہی جسم پر چپکی ہوئی ہیں بار بار وہ انگلیوں سے ایسی تصویروں کے خطوط چھو کر ان کے حسن و قبح پر بحث کر رہے تھے۔ جس کے جواب میں گھبرا کر مجھے اپنے بٹوے میں کوئی نہایت ہی ضروری چیز ڈھونڈنا پڑتی تھی۔ گھما پھرا کر وہ عورتوں کے سینوں کے اوق مسئلہ پر آتے تھے

اور آنکھوں میں میٹھی میٹھی نمی پیدا کر کے اپنے سوکھے ہاتھوں سے سلیقے ڈھال ڈھال کر تشریح کر رہے تھے باوجود اس قدر ڈھیٹ ہونے کے کئی دفعہ مجھے قالین کے نقش و نگار گھورنے پڑے۔ ہر جنبش پر یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ میرے جسم کو آٹے کی طرح خوب پیروں سے گوندھ کر بھیانک سا پتلا بناتے ہیں پھر بگاڑ دیتے ہیں۔ انہیں بھی مجھے اس طرح نچوڑنے میں کچھ مزہ آرہا تھا۔ کیونکہ وہ برابر مسکرا رہے تھے۔ جل کر کئی دفعہ جی میں آیا کہ ان کے بھی کسی حصہ جسم کا ایسا مذاق بناؤں کہ ایک دفعہ تو غلیظ مسکراہٹ سے بھری آنکھ بھی جھینپ جائے۔ مگر تہذیب نے زبان پکڑ لی۔

موقع پا کر میں لپکی اپنے کمرے کی طرف۔ گیلری میں ایک دوبی نوجوان نگار کو بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا اور وہ اوں اوں کر کے اسے کھسوٹ رہی تھی۔ پلنگ پر لیٹ کر نہ تو نیند ہی آئی اور نہ ہی کچھ کام ہو سکا۔ دوسرے دن انسپکٹرس آنے والی تھی۔ مجھے اس کو رجھانے کے لئے سوسو بناؤ کرنا تھے۔ سبق موثر ہو۔ انداز گفتگو مرعوب کن، لباس مدبرانہ اور چال ڈھال میں نرمی آمیز دبدبہ ـــ جماعت کی توجہ بورڈ کا استعمال ـــ سوال و جواب کی اہمیت ـــ میرے معزز پیشے کے شر لینا نہ گر! لیٹے لیٹے میں یونہی ورزش کرنے لگی۔ پھر ایک دم مجھے خیال آیا جو کوئی مجھے اس طرح دیکھ لے تو۔ کسی کی موجودگی کے خیال سے مجھے ایک دم تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا۔ میں کتنی اکیلی ہوں۔ سوائے ان قہقہوں کے جو مہیب چٹانوں کی طرح سیٹھانی کے فلیٹ سے لڑھک لڑھک کر میرے دماغ سے ٹکرا رہے تھے۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور تالیوں کی آوازیں

ایک بار کی میرے جسم میں ریگ کر ہزاروں نبضوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگیں اور پھر جلدی نے دماغ میں کروٹیں لینا شروع کر لیں۔۔۔

اگر ان کروٹوں کا ایک رخ بھی کسی کو دکھائی دے جائے تو ـــــ تو نہ جانے کیا ہو۔ میں اسی خوف سے لرزا کرتی ہوں۔ مثلاً یہی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سیٹھانی بن کر سنور کر اپنے گاہکوں کو پیٹ کی خاطر لبھاتی ہیں۔ میں بھی کیل کانٹے سے درست ہو کر اپنے گاہکوں کے دربار میں جاتی ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ میری عقل ـــــ ابھی چوسی ہوئی گنڈیری ـــــ اور سیٹھانی ـــــ یعنی مکمل رس کا گھڑا میں دماغ بیچتی ہوں اور سیٹھانی جسم! اور میں دماغ کا مول سیکنڈ ہینڈ ٹائر کے برابر لیتی ستر روپیہ اور سیٹھانی اپنی ایک انگڑائی میں اتنا کما لیتی ہیں کہ میرے ابا حکومت برطانیہ کے اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود ساری عمر میں نہ کما سکے۔ ہم دونوں ہی بازار میں اپنے اپنے خوانچے لگائے بیٹھی ہیں۔ مال مختلف۔ مگر مقصد وہی میرے مرجھائے ہوئے دماغ کی حیثیت ان کے دبیز جسم کے آگے ایسی ہی ہے۔ جیسے پان بیڑی کی دکان کے آگے کرکٹ کلب۔ یقیناً میرا سودا برابر رہا اور میں جلنے لگی۔ اپنے تخیل سے بھڑکائی ہوئی آگ میں۔ لوگوں کو طوائفوں پہ رحم آتا ہے۔ ان کے سدھار کی فکریں ہیں یہ نہیں کہ وہ تائب ہو جائیں۔ نہیں بلکہ جو بری گت سے ہیں۔ ان کے دن پھر جائیں۔ ان کے میلے کپڑے زرق برق ہو جائیں سڑے بسے گندی نالیوں کے پاس جو مکان ہیں وہ "میرین ڈرائیو" پر پہنچ جائیں گاہک آئیں مگر نہ اتنے کہ ان کا جی میلا ہو جائے اور یہاں تنخواہ کا گریڈ ہر سال گر جائے۔ کچھ پرواہ نہیں۔ طالب علموں یا دوسرے لفظوں میں دوزخ سے

دروغاؤں کی تعداد دگنی ہو جائے۔ ہیڈ معلمہ چوکس ڈالے۔ دفتر کے کلرک جھنبوڑ ڈالیں۔ کمیٹی کے ممبر ڈکار جائیں ـــــ کچھ پرواہ نہیں۔ استانیاں بچوں کے دماغ بنا رہی ہیں اور طوائفیں لاوارثوں کے دل کی ٹھنڈک ـــــ دونوں ہی اپنا اپنا کام کر رہی ہیں ـــــ پھر یہ کیوں ؟

جب رات اتنی دماغ کشتی لڑی ہو تو انسپکٹرس کے سامنے کیا ناز و ادا چلیں نتیجہ یہ کہ اس سال جو مستقل ہونے کی امیدیں تھیں۔ رخصت! جو مسلسل روح فرسائی کا ارمان تھا ختم! اف جس نے اپنی زندگی ہی قوم پر قربان ہونے کے لیے وقف کر دی ہو ...... وہ ..... مگر قوم اں ادھر مری گالیاں سے گھن کھا چکی ہے۔ یہ بیمار بکریاں ـــــ ان سے قوم کہتے آتی ہے!

دوسرے دن سیمانی تیہرآن پہنچیں ـــــ اور مجھے ایسے نصیحت کرنے لگیں کہ کوئی میں بھی ان کے پڑوس کی ہوں اور اندھا دھند زندگی گزار رہی ہوں

"وہ اسے ہے بس سہروردیت پڑھتا ـــــ اللہ مارا دماغ بھی ہل جاتا ہوگا" میں منمنا کر چپ ہو رہی۔

"دیکھو تو کیا شکل نکل آئی ہے" ـــــ انہوں نے رحم کھانا شروع کیا اور میرے دل میں بغاوت کا بھوت ناچا یہ مجھے کیوں چھیڑتی ہے خوامخواہ۔ یا اللہ یہ میں کہاں آ گئی؟ اوپر سے تو یہ عمارت بالکل شریفوں کے رہنے کی معلوم ہوتی ہے۔ بورڈ پر نام بھی شریفوں جیسے ہیں! مس کوٹینو...... مس واکر...... مسز عبداللہ، مس رشید ...... مسز......

"حمید صاحب تم سے پھر ملنے کو کہتے تھے" ـــــ یہ وہی ایڈیٹر صاحب تھے!

ارے تو کیا اس نے واقعی مجھ سے پیشہ کرانے کا پکا فیصلہ کر لیا؟ یعنی اپنے گاہکوں میں سے مریل چھانٹ کر مجھے دیتی جائے گی۔

"بھئی آج تمہیں ضرور سنگھارے کر جاؤں گی" ــــ وہ اٹھلائیں۔

مگر مجھے تو ــــ "واضح رہے کہ میرا پیشہ باعزت ہونے کے علاوہ کافی محنت طلب ہے۔

"ارے ہٹاؤ بھی تمہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے۔ حمید صاحب تمہارے لیئے خاص طور پر پاس لاتے ہیں اور تم ہو کہ ٹال رہی ہو ــــ ارے یہی تو ہنسنے بولنے کی عمر ہے۔"

یا مولا ــــ تو اب میرا مہذب پیشہ ختم اور یہ "ہنسنے بولنے" کا پیشہ شروع ــــ توبہ اگر میری اماں بچاری کو معلوم ہو تو کیا حال ہو ان کا ــــ کہ ان کی نیک بیٹی کو بہکایا جا رہا ہے اور یہاں تو سودے بھی ہو گئے۔ آج پاس آ گئے، کل بنارسی ساڑھی، پرسوں ہیرے کے بندے اور اترسوں وہ خود مع اپنے معصورانہ خیالات کے۔ اور وہ پیران کے وہ کھردرے سوکھے ہاتھوں سے ساپنچے بنا بنا کر ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ!

میں نے دکھائی سے انکار کر دیا اور وہ مضمحل سی بڑبڑاتی چلی گئیں۔

"توبہ ایسا بھی کیا ــــ جبھی تو کہتے ہیں اتنا پڑھانا لکھانا بھی اچھا نہیں لڑکیوں کا۔"

جی ہاں! کیوں نہیں ــــ پڑھ لکھ کر کریں گی ہی کیا ــــ آپ کا لطیف پیشہ سلامت رہے۔ کیا ضرورت ہے کہ دماغ پچی کرے کوئی! میری سمجھ میں نہ آیا کہ باوجود اتنی بدمزاجی کے مجھ میں کیا دلچسپی تھی جو بار بار پڑوسن آتی تھیں۔

میں کاپیاں درست کرنے لگی یا خدا یہ فیل ہونے والے بھی جان جان کر جلاتے ہیں۔

جی جاتا ہے۔ صفر سے بھی کوئی ذلیل تعداد ہو تو وہ نکال کر دوں انہیں مرین کبخت جی جا جا جو فیل نہیں ہوئیں۔ ان کو بھی فیل کر دوں ــــ تاکہ سب کی سب سیٹھانی کی طرح تباہی کے غار میں گر پڑیں۔ پھر ایک دم سے میں نے سوچا نہیں ــــ یہ تو نہایت عجیب سزا ہوگی ــــ بہتر یہی ہے کہ میں انہیں اپنی طرح قوم کی خدمت کے لیے باہمت اور محنتی استانیاں بنا دوں ــ تاکہ ــ تاکہ ــ وہ بھی۔۔۔۔ آگے سوچنے کی طاقت ڈنگھیا کر رہ گئی۔

سیٹھانی اور نگار ہنستی کھلکھلاتی حمید صاحب اور دو چار اور بھنکتے ہوئے عاشقوں کے ساتھ سنیما گئیں۔ جب وہ آئیں تب بھی میں جاگ رہی تھی۔ جہاں غنودگی آئی اور عفریتوں نے دانت نکال کر حملہ کیا۔ بھلا اس دماغ کون کام کر سکتا ہے۔ دو چار دن اور رہی رنڈی کے پڑوس میں تو نہ جانے کیا ہو۔ میرے خیالات دن بدن الجھتے جا رہے تھے۔ خود اپنے ضمیر سے بات کرتے ڈر لگتا تھا کہ نہ جانے کمبخت کیا بول اٹھے۔

میں سر پکڑے پلنگ پر بیٹھی رہی ــ تھکی ہاری سیٹھانی سو گئی تھی۔ فلیٹ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند واہیات خیالات دل میں جھلنے لگے۔

ذرا ڈھیل دی تو ریلا ٹوٹ پڑا ــ قہقہہ پر قہقہہ میرے دماغ میں سے ابلنے لگا مگر میرا چہرہ نہ ہنسا۔۔۔۔ عزت پاک بازی۔۔۔۔۔۔ گندے انڈے کی طرح لوٹے کے نیچے دبائے بیٹھے رہو۔۔۔۔۔۔ تو کیا اس میں سے سرخاب نکلے گا؟ اور پھر تماشہ یہ کہ کوئی بھی اس گندے انڈے کی سیوا کا پھل نہیں دیتا۔ قوم کو ذرا بھی احساس نہیں ــ کہ ایک دیوی یوں پارسائی کا پٹارہ اٹھائے جی جا رہا اٹھا کر بیچ سڑک پر ایسی جگہ چھوڑ دوں کہ ہر آنے جانے والا غلاظت سے لتھڑ جائے۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا۔

یہ سب اس زندگی کے پڑوس میں رہنے سے ہوا! مجھے فوراً اپنی سہیلی بینا یاد آگئی:
اف بینا کتنی حسین اور چلبلی تھی اور پھر وہ مسلسل نو سال پڑھاتی رہی۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ایک دن
بوکھلا کر اس نے ایک غلیظ بڈھے سے شادی کر لی۔ ۔ ۔ وہ تو کہتی تھی کہ وہ اس کی قومی
خدمات کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ وہ سولہ برس جیل کاٹ کر آیا تھا اور کسی زمانہ
میں حسین بھی تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ بینا قوم کی خدمت کی آڑ لے رہی ہے۔ جیسے
سیٹھانی برہنہ تصویروں کی آڑ لیتی ہے۔ دراصل بھوک میں کواڑ پاپڑ ہو جاتے ہیں۔
میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ فلیٹ بدل دوں گی۔ ورنہ جو ہر بے بہا کیچڑ میں جا چھپے
گا اور وہ دولت جس کے پیچھے مشرقی عورت جان دے دیتی ہے۔ مٹی میں مل جائے گی۔
نیا میں عورت کے پاس یہ عصمت ہی تو ایک شے ہے جیسے کوئی پیٹ کی خاطر
اتی ہے۔ تو کوئی اس کی خاطر جان لٹا دیتی ہے۔ لے دے کر یہی ایک ترپ کا اکہ
جو ہر داؤں پہ مار سکتی ہے۔
تھک ہار کر خیالات میں الجھی سونے کی کوشش کرنے لگی۔
صبح اٹھ کر میں جب نیچے جانے لگی تو سیٹھانی پھل والے سے کھڑی الجھ رہی تھی
یکھ کر غیروں کی طرح منہ پھیر لیا فخر سے میرا سر اونچا ہو گیا آخر کو اسے معلوم ہو
لیا کہ میں شریف ہوں۔ اور وہ بازار کی جنس!
اس کے دو چار دن کے بعد کا ذکر ہے کہ میرے ماموں زاد بھائی اور سان کی
ملنے آئے۔ جب سے میں نے یہ فلیٹ لیا تھا میں ڈر رہی تھی کہ وہ شاید یہ
ر جا ئے پا ہوں کہ میں ایسے پڑوس میں رہتی ہوں۔ جیسے ہی وہ آئے سیٹھانی
فلیٹ سے قہقہے بڑی بڑی چٹانوں کی طرح لڑھک کر گرنے لگے۔

میں نے اٹھ کر زور سے دروازہ بھیڑ دیا۔

"کمبخت ہر وقت بد تمیزیاں ہوتی رہتی ہیں۔"

"کہاں؟"

"یہاں — کمبخت ایک طوائف رہتی ہے — ہر وقت ٹھٹ لگا رہتا ہے۔"

"طوائف؟ — یہاں؟ — مگر یہ تو زنگار کی آواز تھی" وہ چونکے

"ہاں — آپ جانتے ہیں انہیں — ؟ میں نے معنی خیز نظروں سے ان کی بیوی کو دیکھا۔

"ہاں ہاں بھئی — ارے تم نہیں ملیں ان سے — میں نے زنگار کے ٹانسلز کا اپریشن کیا تھا — ارے یہ تو بڑے خاندانی لوگ ہیں یہ

"یہ — یہ — سیٹھانی —"

"ہاں بھئی — سیٹھ عبداللہ کی بیوی ہے — سر عبدالکریم کے خاندان میں سے ہیں — اور دلی کی ہیں۔ ان کی بیوی — چشتیوں کے خاندان کی ہیں اور رضیہ کی خالہ لگتی ہیں"

"ہمارے رضیہ بولیں۔

اور میں حیرت زدہ ان عبرتناک زلزلوں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی، سن رہ گئی۔ جیسے میں نے کسی مقدس کتاب کو ٹھوکر مار دی ہو — اور کفارہ — کفارہ میرے امکان سے باہر ہو۔"

"تو — تو وہ کوئی دوسرا فلیٹ ہو گا" میں نے ہکلا کر کہا۔

بہو بیٹیاں

یہ میری سب سے بڑی بھابی ہیں۔ میرے سب سے بڑے بھائی کی سب
سے بڑی بیوی۔ اس سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میرے بھائی کی خدا
نہ کرے بہت سی بیویاں ہیں۔ ویسے اگر آپ اس طرح سے ابھر کر سوال کریں تو
میرے بھائی کی کوئی بیوی نہیں، وہ ایک کنوارا ہے۔ اس کی روح کنواری ہے
ویسے دنیا کی نظروں میں وہ بڑی بھابی کا خدائے مجازی ہے اور ان تین بچوں کا
باپ ہے۔ اس کی شادی ہوئی۔ دولہا بنا۔ گھوڑے پہ چڑھا، دلہن کو گھر لا کر پلنگ
پر بٹھایا پھر پاس ہی خود بھی بیٹھ گیا اور جب سے برابر بیٹھا رہا ہے۔ لیکن تصوف شناس
کی باتیں سمجھنے والوں ہی کو معلوم ہے کہ وہ کنوارا رہا ہے اور سدا کنوارا رہے گا۔ اس
کا دل تو بیاہا گیا اور نہ کبھی بیاہا جا سکے گا، وہ نہ کبھی دولہا بنا نہ گھوڑے پہ چڑھا نہ دلہن کو
لایا۔ اس کے گلے [illegible] ہوا۔ وہ تو اس کا باپ تھا جس نے اس کی بات طے کی۔ ایسے
بیزار سے منتشر چہرے کی ادا سے [illegible] سے وہ بغاوت کے ہنگاموں میں تنہا رہا مگر یوں تھا

کر سکا. کیونکہ وہ جانتا تھا. اس کے باپ کے ہاتھ بڑے تگڑے ہیں اور جو تے اس سے بھی تگڑے اس لیے اس نے بہتر سمجھا کہ وہ شہید تو ہو ہی رہا ہے. جو تے سے شہید نہ ہو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا. لہٰذا وہ دولہا بنا اور سہرے کے پیچھے تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ ایک اور سہرا بندھا ہے جو اس کے ارمانوں کے خون خون میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں سے گوندھا گیا ہے. جس میں اس کی نہ سنائی دینے والی سسکیاں پروئی ہوئی ہیں. جس میں اس کے مسلے ہوئے جذبات اور کچلی ہوئی مسرتیں بندھی ہوئی ہیں. وہ گھوڑے پر نہیں چڑھا. اس کی میت ماں باپ کی ہٹ دھرمی کے گھوڑے پر لٹکادی گئی. وہ اپنی دلہن نہیں لایا بلکہ وہ باپ کی دلہن تھی. ان ہی کی بیاہتا تھی.

مگر ایک مجبور بیٹے کی طرح بنا آہ و زاری کئے وہ دلہن کے پاس بھی گیا اس کا گھونگھٹ ہٹایا مگر وہ یہی ارادہ کر چکا تھا کہ وہ خود وہاں نہیں، یہ اس کا باپ ہے جو اس دلہن کا دولہا ہے. مگر چونکہ میری بھابی اس وقت بڑی نہ تھی. میرا مطلب ہے جسمانی طور پر وہ دبلی پتلی اور نازک سی چھوکری تھی. اس لیے ایک لمحہ کو میرے بڑے بھائی کا جسم اس سے بیاہ گیا لیکن بہت جلد ہی وہ دبلی پتلی عورت بڑھنا شروع ہوئی اور چند سال ہی میں وہ پھول پھال کر بے ڈھنگے گوشت کا ڈھیر بن گئی. میرے بھائی نے اس کے اوپر چڑھتے ہوئے گوشت کو نہ روکا. اس کی جوتی روکتی. وہ اس کی تھی کون.

لیکن وہ بچے ..... اس کے ماں باپ کے بچے جنہیں وہ کبھی بھولے سے بھی نہ چھوتا تعداد میں بڑھتے رہے. ننگے سڑ سڑاتے میلی ٹانگیں اچھالتے واویلا

مچاتے مگر میرے بھائی کے دل کے دروازے ویسے ہی بند رہے۔ وہ ایسا ہی کنوارا اور بانجھ رہا۔ میری بھابی کچھ ایسی ان مرحلوں میں پھنسی کہ اس نے پلٹ کر بھی بھیا کی طرف نہ دیکھا۔ جانے کہتی ہوں، میں تو پہلے ساس سسر کی بہو ہوں، نند کی بھوجائی ہوں، بچوں کی اماں ہوں، نوکروں کی مالک ہوں محلے ٹولے کی بہو بیٹی ہوں پھر اگر وقت ملا۔ تو تمہاری بیوی بھی بن جاؤں گی۔

بھیا کو اس طرح کی ساجھے کی ہانڈی بڑی پھیکی سیٹھی اور بے مزہ لگی اور اس نے اپنا دل سنبھال کر اٹھایا۔ بکھرے ریزے سمیٹے اور تلاش میں نکل کھڑا ہوا اس نے کتنے ہی آستانوں پر اس چکنا چور شیشے کے ٹکڑے کو جا کر رکھا۔ مگر کوئی مرہم کوئی دوا ایسی نہ ملی جو ان ریزوں کو جوڑ دیتی اس لیے وہ اب بھی اپنا کنوارا دل لیے پھر رہا ہے۔ کسی دل والی کی تلاش میں۔

اس نے دل والیوں کو رنڈیوں کے کوٹھے پہ ڈھونڈا۔ گندی گلیوں میں گھومنے والی مکھیا بیوں میں تلاش کیا۔ ریڈیو اسٹیشنوں پہ گانے والی حسیناؤں اور آرٹسٹوں میں ٹٹولا۔ ہسپتالوں کی نرسوں میں بھی جستجو کی۔ فلمی پریوں کی گپھاؤں میں بھی جھٹکا اور اکسٹرا لڑکیوں کے جھرمٹ میں بھی جھانکا۔ جاہل گاؤں کی گنواریوں، سڑک کی کوٹنے والیوں مچھیرنوں اور بھٹیاریوں کے آگے بھی ہاتھ پھیلایا۔ ڈرائنگ روم میں اُگنے والی اور بال روم میں تھرکنے والی شریف زادیوں سے بھی بھیک مانگی مگر اسے دل والی کہیں نہ ملی لاکھوں ہی گھونگھٹ پلٹ ڈالے۔ مگر وہی عورت وہی ساس سسر کی بہو وہی ن کے بال بچوں کی ماں دکھائی دی۔

میری بھابھی سب سے بڑی سہی۔ مگر زیادہ عقلمند ہرگز نہیں۔ اس نے میاں کو

جھوٹے بہلاوے کبھی نہ دیتے۔ جیسے پہلے ہی رات کو وہ سمجھ گئی ہو کہ اپنی جان گھسانا حماقت ہے۔ ان تلوں سے تیل نہ نکلے گا اور وہ دنیا سے جی کڑوا کرکے کالے کلوٹے، ٹیڑھے بھینگے بچے تو خود بخود اس کے پیٹ میں تعمیر ہوتے رہے۔ وہ تو اُبکائیاں سہنے اور بدوضع بننے کے سوا کچھ بھی نہ کرتی رہی اور یہ بچے میرے بھیا سے انتقام لینے کا مفید آلہ ثابت ہوئے۔ جب ناک چاٹتے۔ ننگ دھڑنگ بسورتے ہوئے کیچڑ سے کسی محفل یا پارٹی میں میرے بھیا کو چھو دیتے ہیں تو وہ ایسے اچھل پڑتے ہیں۔ جیسے بچھو نے ڈنک لیا ہو اور جب کبھی بھولے سے کوئی احمق مہمان گھر میں آجاتا تو یہی تہذیب اور نفاست کے قاتل ادب اور سلیقے کے دشمن اس کی چھاتی پر کود دل کر اس کو ڈوب مرنے کی ترغیبیں دیا کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ گھر کے میلے کچیلے، میلے فرش اور چھچھلانے برتن ایک نفیس دماغ روح کو ابدی مرگھٹ میں سلگانے کے لیے کافی نہ پاکر میری بھابی نے جملہ ترکیبوں اور خوش گفتاریوں کے زریں نسخے استعمال کرکے آنے جانے یا مستقل رہنے کے شوقین رشتہ داروں کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا ہے۔

اسی لئے تو بیچارہ دل والی کی تلاش میں زن زمین لٹاتا پھرتا ہے۔ کبھی کبھی اسے کوئی مجبور دلنواز موقع پاکر اس کا فرنیچر نرد خت کرکے مکان پگڑی پر اٹھا کر حتیٰ کہ اس کے کپڑے بھی اپنے نئے عاشق کے لیے لے کر بھاگ جاتی ہے اور وہ پھر ویسا ہی لنڈورا اور یتیم رہ جاتا ہے۔

ویسے بھی اسے عشق راس نہیں آتا جہاں کے لوگ آوارگی کرتے ہیں۔ پر گھنٹیاں کسی کے گلے میں نہیں لٹک جاتیں۔ وہ تو اگر بھولے سے کسی کی طرف مسکرا کر بھی دیکھ لیا

تو وہ عورت فوراً حاملہ ہو جاتی ہے اور اس کی جان پر ایک عدد تحفہ نازل کر دیتی ہے جسے وہ بلی کے گو کی طرح چھپاتا پھرتا ہے۔ وہ اپنے جائز بچوں سے ذرا نہیں شرماتا مگر اس کی علتوں سے اس کی عزت پر حرف آنے کا خوف ہے، وہ بڑا باعزت ہے نا۔

وہ اپنی اس مصیبت کو دنیا کی سب سے بڑی آفت سمجھتا ہے۔ جب اس کے دل کی دنیا اجاڑ پڑی ہے۔ تو لوگوں کو بھوک، مہنگائی اور بے کاری جیسی بے مصرف چیزوں کے بارے میں کچھ سوچنے کا کیا حق ہے۔ دل ہے تو سب کچھ ہے۔

آپ سمجھیں گے کہ وہ کوئی جنسی مریض ہے۔ عورت کا بھوکا ہے۔ جی نہیں اس ظالم عورت کی وجہ سے تو اسے بارہا شدید قسم کی بدہضمی بھی ہو چکی ہے۔ تو بات دراصل یہ ہے کہ وہ ایسے ماحول کی پیدائش ہے۔ جہاں غم دنیا کو غم عقبیٰ کی آڑ میں چھپا دیا جاتا ہے۔ جہاں ہر جسمانی محرومی کا الزام نصیب کے سر اور روحانی تشنگی کا ٹھیکہ معشوق کے ذمے ہے۔ وہ قسمت کے پیچھے ڈنڈا لئے کر پڑا ہوا ہے۔ ایک دن اسے نصیب کہیں ڈوبکا ہوا مل جائے گا اور وہ اس کا سر پاش پاش کر دے گا۔ پھر وہ ہوگا اور اس کی محبوبہ لیکن اسے اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس کا نصیبا اس کی پیٹھ پر بیٹھا ہے۔ اور اس کی چربی چڑھی ہوئی آنکھوں کو کبھی نظر نہ آئے گا۔

اور ان کڑوے کسیلے ماں باپ اور فرسودہ نظام کے سلسلے میں کون درجن بچے پروان چڑھ رہے ہیں آنے والی پود اگ رہی ہے اور زندگیاں سانچوں میں ڈھل رہی ہیں۔ نامعلوم منزل تک گھسٹنے کے لئے دنیا میں تلخی اور افلاس کی پال پوس کرنے کے لئے۔

یہ میری دوسری بھابی ہے، میرے بھائی کی انمول دلھن۔ اس کی قسمت کا چمکتا دمکتا سورج اس کی مشعلِ راہ۔ میرا بھائی بڑا ہی تقدیر والا ہے۔ اس نے ایک غریب گھر میں جنم لیا دیوں کی ادھ مری روشنی میں پڑھ پڑھ کر ایک دن جب روشن ستارے کی طرح جگمگایا تو ایک بڑی سی مچھلی آئی اور اُسے ثابت نگل گئی۔

جوں ہی اس نے اول نمبروں سے بی۔ اے۔ پاس کیا نواب گھمن کی نظر التفات اس پر پڑ گئی۔ نہ جانے کدھر کے رشتے ناطے جوڑ توڑ کر پروفیسروں کے ذریعے کانٹا مارا اور دیکھتے ہی ایک چھوڑ ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گئے پھر اسے اپنی سب سے چہیتی باندی کی سب سے لاڈلی بیٹی کو بخش دیا۔ بادا بہتیرا اُچھلے مگر ایک طرف تو تھی نوابی زادی اور انگلینڈ جانے کا خرچہ اور دوسری طرف کھوسٹ باپ اور اپاہج ماں اور بن بیاہی بہنوں کی پلٹن اور آدھ پڑھے بھائیوں کی فوج۔ ظاہر ہے کہ بازی بڑے حلق والی مچھلی کے ہاتھ رہی اور بقیہ جونکیں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ اماں کو سمدھن بننے کا شوق۔ بہنوں کو نیگ اڑانے کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی اور پوت پتنگا بن کر سات سمندر پار اڑ گیا۔

اماں نے جی پر پتھر رکھ لیا تھا کہ بلا سے مڑی نیچی ہے۔ تو جہیز ہی سے آنسو پونچھ جائیں گے۔ ماشاء اللہ استے سامان سے پلٹن کے دو چار سپاہی تو لیس ہو جائیں گے دو لہا کی سلامی سے ہی دو تین بھائیوں کی ناؤ پار اُتر جائے گی۔ مگر سارے ارمان سارے حوصلے پھر سے اڑ گئے۔ جب نواب کی ایک کوٹھی دلہن کا مائکا اور دوسری سسرال بنی اور بہو ایک کوٹھی سے دوسری کوٹھی کو بیاہ دی گئی۔

انگلینڈ سے لوٹ کر دولہا بیاہ کر سسرال چلا گیا اور اماں باوا اپنے سر سے

دوسرا پودا سینچنے پر جُٹ گئے۔ پھر کسی دن اس پودے کے چکنے چکنے پات کسی باغبان کو نظر آ گئے تو وہ اسے بھی اس گھورے سے سمیٹ کر اپنے "سرہاؤس" میں لیجا کر رکھ دے گا اور اماں باوا ایڑیاں رگڑتے رگڑتے آخری منزل کو جا کر کمرڈلیں گے۔

اب یہ پہلا پودا اپنے سسر کی ریاست میں کسی مفت خوروں والے عہدے پر فائز ہے۔ علاوہ تنخواہ کے موٹر۔ گھوڑا گاڑی، کوٹھی، بنگلہ، نوکر چاکر اور ایک عدد نواب زادی اسے ملی ہوئی ہے۔ صبح اٹھ کر دربار میں تین سلام جھاڑ چکنے کے بعد وہ دن بھر بڑا کوٹھی میں اینڈتا ہے۔ کبھی کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اس کی حیثیت افزائش نسل کے لیے استعمال کئے جانے والے سانڈھے سے زیادہ نہیں تھا۔ جو تھان پر بندھا اگلی ہوئی تے کی جُگالی کئے جا رہا ہے۔

اس کی بیوی یعنی نواب زادی کبھی اس کے غلیظ گھر نہ آتی۔ مگر جب بوڑھے باپ نے دنیا کی جنگ سے عاجز آ کر ہتھیار ڈال دے تو وہ مع اپنے پورے تام جھام کے دو گھڑی کو آئی۔ اس وقت بیچارے نوابی داماد کی شرم کے مارے بُری حالت ہو گئی جیسے گورنر وائسرائے کی سواری آ رہی ہو تو ایک صاف سی سڑک چن کر جھنڈیاں لگا دی جاتی ہیں تاکہ وائسرائے سمجھے کہ سارا ملک ایسا ہی صاف اور جھنڈیوں سے سجا ہوا ہے۔

اس طرح گھر کا سارا کوڑا کرکٹ نظروں سے اوجھل رکھ دیا گیا۔ میت اٹھنے سے پہلے ہی نواب زادی اٹھ کر چل دیں اور ساتھ ساتھ وہ داماد بھی

مگر بڑے حساس دل کا مالک ہے۔ وہ سب کچھ سمجھتا ہے اور اس کے دل پر برف کے گھونسے ہر دم لگا کرتے ہیں۔ اس لیے وہ جلد از جلد اس ماحول میں سمونے

کی کوشش کرتا رہتا ہے اور خود فراموشی کے لئے شراب پیتا ہے۔ تب وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ سہانے موسم آ گئے ہیں اور آس پاس کی ریاستوں کے رنگین مزاج سیر و شکار کو آجا رہے ہیں۔ اس کی بیوی دوسری نوابزادیوں کی طرح ہرنی بن کر چوکڑیاں بھر رہی ہے۔ وہ خود تین سلام جھاڑ رہا ہے۔ آرام دہ کمرے میں سرد پیرسے بے خبر پڑا ہے۔ اب تو اسے اپنی رفیق زندگی کی آنکھوں میں سے گزرتے ہوئے سوال بھی نہیں جگا سکتے۔ وہ یہی تو کہتی ہے کہ "تمہارا مصرف کیا ہے؟ میرے باپ کی جلد بازی نے تمہیں اس جنت ارضی میں لا ڈالا ہے۔ اسے غنیمت جانو جو یہ نہ ہوتا تو جوتیاں چٹخاتے پھرتے"۔ ایسے موقع پر اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ دنیا کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دے پٹخے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مگر وہ اس خیال کو اپنے دماغ میں جڑ پکڑنے سے پہلے اکھاڑ پھینکتا ہے دنیا جانتی ہے کہ وہ انگلینڈ سے کوئی ڈگری یا ڈپلوما تو لا نہ سکا اس کے جاتے ہی صاحبزادی صاحبہ کو دل کے دورے پڑنے لگے اور انہوں نے رو رو کر اُسے واپس بلوا لیا اس لیے بیچارے کی حالت ایسی نیم پخت روٹی جیسی ہے جو قبل از وقت توے سے پھسل کر گھی میں آن گری ہو اوپر سے کاہلی اور بے کاری کی پھپھوند نے اسے اور بھی بے مصرف بنا دیا۔ وہ ائرکنڈیشن کمروں میں سو سو کر اپنی پرانی کچی کھپریل سے کانپنے لگا ہے۔ فلش کا عادی ہو کر اسے غلیظ کچے سنڈاس کے خیال سے بخار چڑھتا ہے۔ اس کی قسمت کا ستارہ بلندیوں پر ٹمٹماتا ہے۔ جسے پکڑنے کے لیے وہ آوارہ بگولے کی طرح سرگرداں ہے۔

اور جب وہ بہت تھک جاتا ہے تو غصے میں آ کر وہسکی کی مقدار پیگ میں دوگنی

کر کے پرسکون جمائیاں لینے لگتا ہے۔ یہی اس کی کش مکش ہے اور یہی زندگی کی جدوجہد نمک کی کان میں جاکر وہ بھی تو نمک کا کھمبا بن چکا ہے۔

جب ان نمک کی کانوں پر پھاوڑوں کی چوٹ پڑے گی اور ان کے پرخچے اڑاکر روٹیوں میں گوندھ ڈالے جائیں گے تو اس خالص نمک کے تودے کی روٹی نمکین نہیں بلکہ کرکری ہوگی، پھر اس کرکری روٹی کا نوالہ بھی تھوک دیا جائے گا۔

میری ایک اور بھابی بھی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ کہلاتی ہے۔ اسے ایک کامیاب بیوی بننے کی مکمل تعلیم ملی ہے۔ وہ ستار بجا سکتی ہے۔ پینٹنگ کر سکتی ہے۔ ٹینس کھیلنے، موٹر چلانے اور گھوڑے کی سواری میں مشاق ہے۔ بچوں کی پرورش آیا سے بخیر وخوبی کروا سکتی ہے۔ بیک وقت سو ڈیڑھ سو مہمانوں کی آؤ بھگت کر سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے۔ بیرا لوگ کو اپنی نگرانی میں لے کر بڑے لاڈ پیار سے اس کی کانونیٹ میں تربیت ہوئی اور جب خدا رکھے سن بلوغ کو پہنچی تو اس کے روشن خیال والدین نے اس کے حضور میں ہونہار امیدواروں کی ایک رجمنٹ کو پیش ہونے کی اجازت دے دی۔ ان میں آئی۔ سی۔ ایس بھی تھے اور پی۔ سی۔ ایس بھی تھے۔ حسین اور تعلیم یافتہ بھی تھے، بدصورت اور دودھاری گائیں بھی اشرفیوں کے تھیلوں کے ساتھ ساتھ منہ کا مزہ بدلنے کو کچھ ادیب بھی اور شاعر بھی اور پھر اس سے کہہ دیا کہ بیٹی تیرے آنکھیں بھی ہیں اور ناک بھی۔ خوب ٹھونک بجا کر ایک بکرا چھانٹ لے۔

سو اس نے خوب جانچ پڑتال کر ایک اپنے ہی پلے کا بھاری بھرکم چن لیا، اور اس پر عاشق ہوگئی جس کی داد اس کے والدین نے عظیم الشان جہیز کی صورت

میں دی۔

لوگ اس ہنس ہنسی کے جوڑے کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور وہ بھی شدتِ الفت میں بیتاب ہوکر ایک دوسرے کو "ڈارلنگ" کہتے ہیں۔

دونوں میاں بیوی ایک ہی فرمے کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے مزاج یکساں پسند اور ناپسند یکساں، غرض ہر بات یکساں ہے۔ دونوں ایک ہی کلب کے ممبر ہیں۔ دونوں ایک ہی سوسائٹی کے چہیتے فرد .... ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے اتنی شدید قسم کی نفرت ہے کہ مہینوں ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھتے۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔

میاں کا ایک دوسرے اعلیٰ افسر کی بیوی سے مشہور و معروف قسم کا عشق چل رہا ہے۔ اور بیوی اس کے ایک ہم عصر سے مانوس ہے۔ ان کی بیوی اپنی سہیلی کے میاں سے اٹکی ہوئی ہے۔ یہ سہیلی ایک سارجنٹ کے دام الفت میں گرفتار ہے۔ جس کی اپنی بیوی ایک بوجھل سے سیٹھ کے پاس رہتی ہے۔ جس کی پرانی چیچک رو بیوی منیجر سے الجھی ہوئی ہے۔ جو اینگلو انڈین لڑکیوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ جو ملٹری کے نوعمر .... او نہہ چھوڑیئے بھی کیا فائدہ دخل در معقولات سے میرے بال نائی کے پاس نائی کا استرہ میرے پاس۔ میرا استرہ گھسیارے کے پاس۔ اس طرح یہ زنجیر ایک حلقہ کے منہ میں دوسرے کی دم لیئے دنیا کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ میری بھابی بھی اس زنجیر کا ایک حلقہ ہے اور وہاں جب تک لٹکی رہے گی۔ جب تک زنجیر کرۂ ارض کو جکڑے رہے گی ———

اور میری تیسری بھابی تو جگ کی دلہن ہے۔ وہ اس سڑک کے مانند ہے جس

پہ سب پلتے ہیں۔ اس چھاؤں کی طرح ہے جو ہر تھکے ماندے کو اپنی آغوش میں تھپکیں دے کر خود فراموشی کے اسباب مہیا کرتی ہے۔ وہ ساجھے کی ہانڈی ہے۔ جو آگ میں چڑھا ہے پر پھوٹے گی، وہ جنہیں منہ کا مزا بدلنے کے لیے نعمت خانہ میں مال مصالحہ رکھنے کی توفیق نہیں۔ وہ اس صلائے عام سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وہ روز شام کو نئے دولہا کی دُلہن بنتی ہے اور صبح کو بیوہ ہو جاتی ہے وہ اپنی ان بہنوں سے خوش نصیب ہے جو اللہ کی دین سے ایک شب میں دس بارہ بار دلہن بنتی ہیں۔ دس براتیں چڑھتی ہیں اور دس بار رانڈ ہوتی ہیں۔ بعض لوگ ناک چڑھی پڑوسنوں کی طرح اس پر ٹیڑھی ٹیڑھی نظریں ڈالتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کچھ تیغ ہے کوئی گناہ کر رہی ہے۔

مگر خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کونسا پاپ کر رہی ہے۔ دنیا میں کیا نہیں بکتا اللہ اور کیا نہیں خریدا جاتا۔ جو لوگ اسے جسم بیچتا دیکھ کر اتنا بلبلا اٹھتے ہیں کیا لوگ پیسے کے عوض اپنے دماغ نہیں بیچتے اپنے تخیلات کا سودا نہیں کرتے۔ اپنا ضمیر نہیں بیچتے۔ معصوموں کا خون بھی تو آٹے میں گندھ کر بکتا ہے۔ کاریگر کا گاڑھا پسینہ بھی تو کپڑے کے تھان رنگ کر فروخت کیا جاتا ہے۔ ایک کلرک کی پوری زندگی چالیس روپیہ مہینے پر بک جاتی ہے۔ ایک منیجر کی پوری عمر کا سودا اتنے ہی داموں پر ہو جاتا ہے تو پھر اس جسم خاکی کے لیے کیوں اتنی لے دے۔

اور اس کا باپ کالے بازار کا معزز ستون تھا۔ اس کا بھائی ناجائز ذرائع سے ناجائز لوگوں تک پہنچاتا تھا، اس کا دوسرا بھائی پولیس کا ذمہ دار فرد ہوتے ہوئے بھی بر ذمہ دارانہ حرکتیں کیا کرتا تھا اور دنیا ان سب کو جانتے ہوئے بھی انہیں گلے سے لگائے

بیٹھی ہے۔ وہ بھی تو آخر انہیں میں سے ایک ہے۔ جہاں آوے کا آوا ٹیڑھا ہے۔ وہاں اس کی بھی کھپت ہونی چاہیئے۔

ویسے وہ کوئی پشتہا پشت کی رنڈی نہیں اس میں اس کا کیا قصور وہ آرٹ کی خدمت کرنے فلم لائن میں گئی اور وہاں سے لگ نہ جانے کب اور کیسے اسے دھیرے دھیرے اس کوسنے میں کھینچ لائے۔ اس نے یہی تو کیا کہ فلم اسٹار بننے کی خاطر ہر آستانے پر سر ٹکایا۔ فنانسر سے لیکر ایکسٹرا ایمک کے گھر کی خاک چھانتے چھانتے وہ خود چھلنی بن گئی۔ اس گڑبڑ میں نہ جانے کون سا میرسل غلط کر گئی جو بجائے آسمان فلم کا درخشاں ستارہ بننے کے بعد وہ یہاں سڑک کے کنارے ٹمٹمانے لگی۔

یہی نہیں کہ اس نے شادی نہ کی ہو، اس نے اس کوچے کی بھی دشت پیمائی کر کے دیکھ لی۔ مگر شادی کے چند ہی مہینے بعد اس کا میاں حسب معمول ادھر ادھر جلنے لگا وہ شاید تنگی ترشی میں بھی گزر کر لیتی۔ مگر وہ جتنے پیر سکوڑتی گئی اتنی ہی وہ چادر کترتا گیا۔ سوائے بیوی بننے کے اسے اور کوئی ہنر نہ آتا تھا۔ وہ چاہتی تو تیس پینتیس کی استانی گیری کر لیتی مگر اتنے روپئے سے تو اسے شمبو کا خرچ چلانے کی بھی عادت نہ تھی یا ہسپتال میں نرس بننے کی کوشش کرتی اور ساٹھ روپے کے عوض خون، پیپ، کھانسی بخار، قے، دست، میں قلابازیاں کھاتی لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس قسم کی حماقتوں میں جان کھپانے کا شوق اس کے خمیر حلول نہیں مجبوراً اسے فلم کے دروازے پر دستک دینی پڑی۔

رنگین فلم ہندوستان میں بنتے تو شاید اس کا میدا شہاب رنگ کچھ برق پاشیاں کر سکتا۔ لیکن ان کم اسلے سفید فلموں میں اس کی چوڑی چپکی ناک اور چندھی آنکھوں نے اسکی

لٹیا ڈبو دی۔ دو چار تھکی ہاری فلمیں بنا کر وہ فنانسر کی آغوش سے گر کر ڈائریکٹر کے پاس آئی وہاں سے پھسلی تو ہیرو اور سائڈ ہیرو کے ہتھے چڑھی اس کے بعد ایک کیمرہ مین لپکا ...... وہاں سے جو ٹپکی تو قعر گمنامی میں کھسک گئی اور جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اس بازار حسن میں معلق پایا مگر وہ اب بڑی سمجھدار ہو گئی ہے اپنے گاہکوں کو بڑی ہوشیاری سے ناپتی تولتی اگر کسی دن کوئی موٹی مرغی، بد صورت بیوی اور غلیظ بچوں کی میکانکی ہاتھ آگئی تو وہ اسے اپنا مستقل گاہک بنا ڈالے گی اور سرکار سے اس استقلال کا سارٹیفکیٹ حاصل کر کے کالے بازار کے آئندہ ستون تعمیر کرنا شروع کر دے گی۔

یہ ہیں آدم و حوا کے جانشین۔ تخلیق کے علم بردار اور دنیا کی گاڑی کو چلانے والے جو بجائے چلانے کے اسے لات گھونسے سے آگے پیچھے دھکیل رہے ہیں۔

مگر ٹھہریئے میری ایک اور بھابی ہے، پر وہ نہ جانے کہاں۔ میں نے ایک آدھ بار صرف اس کی جھلک دیکھی ہے۔ کبھی اس کے ماتھے پر ڈھلکا ہوا نزرتار آنچل کو دیکھا ہے۔ مگر اسے پرچم بنتے نہیں دیکھا۔ ان کی دودھ ایسی پیشانی پر محنت کی افشاں چنی دیکھی ہے۔ مگر اس افشاں میں اودے پیلے نیلے سب رنگ ہیں۔ اور سہاگ کی سرخی کی جھلک نظر نہیں آتی۔ میں نے اس کی حسین انگلیاں تو دیکھی ہیں مگر انہیں الجھے بالوں کا پیچ و خم سلجھاتے نہیں دیکھا۔ اس کی سانولی شام کو شرمانے والی زلفوں کی گھٹائیں دیکھی ہیں۔ مگر انہیں کسی کے تھکے ہوئے شانوں پر پریشاں ہوتے نہیں دیکھا۔ میں نے اس کا چکنا میدے کی لوئی جیسا پیٹ تو دیکھا ہے۔ مگر اس میں ابھی نئی امید کے پودے کو پروان چڑھتے نہیں دیکھا میں نے اس کی چتونیں دیکھی ہیں مگر

انہیں شمشیر بنتے نہیں دیکھا۔

سنتے ہیں سنہرے دیسوں میں وہ آن بسی ہے اور ماتھے کی افشاں اس سہاگ کا سیندور بن چکی ہے۔۔۔۔۔۔ اس کی مہکتی زلفیں جوڑے سے چھٹکے شانوں پر بکھر رہی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں الجھے بال ہی نہیں سلجھا رہی ہیں بلکہ بندوقوں میں کارتوس بھر رہی ہیں اور تلواروں کی دھار پہ اپنی تیکھی چتونوں سے سان رکھ رہی ہیں۔

دور جانے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ یہیں بہت قریب میرے پڑوس میں تلنگانہ کی البیلیاں، جی دار جوانوں کی آرتیاں اتار رہی ہیں اور ان کے ہتھیاروں پر عقیدت کے پھول چڑھا کر سیندور کے ٹیکے لگا رہی ہیں۔

میرا ارادہ ہے کہ ایک دن میں بھی اس سرزمین پر جاؤں گی اور اُن سہاگنوں کے ماتھے کا تھوڑا سا سیندور مانگ لاؤں گی۔۔۔۔۔۔ اور اسے اپنی مانگ میں رچاؤں گی اور پھر وہ میری جیتی بھابی میرے دیس کے کونے کونے میں آن بسے گی۔ اگر ان ساس نندوں کے ڈر سے میری بھابی بن کر نہ آسکی تو میں دعوے سے کہتی ہوں، کہ میری بہو بن کر تو ضرور آئے گی۔

کافر!

"ہٹ ۔ ترے مہادیوجی جیسے ہوئے کی شکل کے رات کو دیکھ لو تو
رچڑھ آئے ۔" میں نے پشکر کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"اور تیرے ۔ تیرے وہ مستان شاہ جی اور مسٹنڈے پیر جو ہر جمعرات
تجھے آشیرباد دینے آتے ہیں جیسے ڈاکو چلا آتا ہے ۔ میری تو انہیں دیکھ
ہی گھگی بندھ جاتی ہے ۔" پشکر نے انگلیاں نچا کر کہا۔
"تو تو کافر ہے پشکر ۔" میں نے مولویانہ انداز سے کہا۔ "تو جہنم میں
ئے گا۔ فرشتے تیرا بدن لوہے کی سلاخوں میں داغیں گے اور آگ کے کوڑے
یں گے خون اور پیپ کھانے کو ملے گا ۔"
"ہے گندی ۔ کیسی جی متلانے کی باتیں کرتی ہے ۔ میں وہ تیرے فرشتے
منہ پہ اُلٹا ماروں گا۔ میں کافر ہوں تو تو کافرنی ہے ۔ تو نے اس دن بابو
سے کہا تھا کہ مجھ سے شادی کرے گی ۔ تیرے بھی جہنم میں کچھ کم جوتیاں

نہیں پڑیں گی۔"

"ہٹ ۔ میں تو مسلمان ہوں اور تو ہندو ہے۔ جناب عالی سارے مسلمان تو جنت میں چلے جائیں گے۔ ہم بھی مزے سے جنت میں جائیں گے، تو ہی رہ جائے گا دیکھ لیجیو۔"

"بہت رہ گیا ۔ میں تجھ سے بھی اچھی جگہ جاؤں گا۔ تو تو مسلمنٹی ہے، تو نرک میں پڑی جلا کرے گی۔"

"سوّر کہیں کا ۔ تو مجھے مسلمنٹی کہتا ہے ۔ تُو ہی ہے بھنگی ۔ کافر ۔ اُتو!"

"تو تُو بھنگن اور کافرنی ہے۔"

میں نے اس کے ایک زور کا طمانچہ مارا۔ وہ کیوں چُوکتا۔ دو دھموکے رکھ دیئے اور ہاتھ الگ مُروڑ دیا۔ میں نے بھی اس کی کلائی میں ناخن ایسے گڑوتے کہ چربی نکل آئی ۔ چاچی جو تی پیزار کی آواز سُن کر دوڑی اور بیچ بچاؤ کر دیا۔

"پشکر کے بچے آنے دے بابو جی کو ۔ کیسی گت بنواتی ہوں۔" چاچی نے پشکر کو گھونسہ دکھا کر کہا۔ جو دیوار کا گھوڑا بنائے بیٹھا میرا منہ چڑا رہا تھا۔

"چاچی اب اِس سور سے میں شادی نہیں کروں گی ۔" میں نے رو کر کہا۔

"اور میں تجھ کلوٹی سے کب کروں گا ۔" "ماں یہ مجھے پیپ خون کھلاتی ہے اوق !" پشکر نے اُبکائی کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"ہے رام۔ ملیچھ کہیں کا۔ چپ۔"

"پنکی ماں یہ کہتی ہے سب ہندو نرک میں جائیں گے اور یہ بڑی آئی ان سے جنت میں جاتے گی۔"

"نہیں چاچی نہیں جاتے گی اور بھیا اور بابو جی بھی نہیں جائیں گے۔ پر یہ تو تو ضرور جائے گا۔" میں نے وثوق سے کہا۔

"میں گیا تو تیری بھی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لے جاؤں گا۔"

"بہت لے گیا۔ وہ زور سے کاٹوں گی کہ مر ہی تو جائے گا۔"

چاچی ہنستے ہنستے لال ہو گئی۔ ارے یہ نرک میں بھی جوتہ چلے گا۔ منی پشکر کو مار ڈالے گی تو پھر یہ نرک سے جائے گا۔"

"اور تب بھی نرک میں جائے گا۔ دیکھ لینا چاچی۔ یہ بڑا کمینہ ہے۔"

"دیکھ۔ ماں پھر میں اس کے ڈھیلا کھینچ کر مار دوں گا۔"

"کیا ہو رہا ہے۔" بابو جی نے اپنی چھتری کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"ہندو مسلم فساد" چاچی نے ہنس کر کہا۔

ڈرپوک پشکر بھاگ بھی گیا۔ چاچی مجھے پیار کرتی لے گئی اور مزے دار ل موٹھ کھلائی۔ چاچی تو مسلمان ہے یہ پشکر ہی کافر ہے۔

دیوالی آئی۔ پشکر کا گھر دیولوں سے جگمگ کرنے لگا۔ میں نے اس سے راملاپ کر لیا۔ اور دن بھر چراغوں کے پیسے بتیاں بٹیں اور کھیلیں اور شکر کھلونے کھاتی رہی۔ چاچی بہت چلائی منی کی بچی ساری پروٹی مسل مسل کر یں ڈال رہی ہے مگر میں بھلا کب مانتی تھی۔ شام کو پشکر سج کر نکلا۔ سفید

جھاگ سی دھوتی۔ سرخ ملیٹہ کا کرتہ۔ خوب مانگ پٹی کیے لال لال ٹیکہ لگائے چاچی بھی بنارسی ساڑھی پہنے، جھانجن جھنکارتی، دیولے سنبھالتی پھر رہی تھی۔ پشکر گھر کی ہر ایک چیز کا محافظ بنا ہوا تھا۔ آج وہ کٹر ہندو تھا۔ اور مجھ سے چھوت کر رہا تھا۔ وہی ندیدہ پشکر جو کتنی ہی دفعہ میرے جھوٹے بیر کھا چکا تھا۔ آج مجھے کچوری دور سے پکڑ رہا تھا۔ میرا دل گڈھ رہا تھا۔

"پشکر! ہمارے بھی چندن لگا دو۔" میں نے اسے پرانے احساسات یاد دلا کر کہا۔

"نہیں" اس نے غرور سے سر ہلا کر کہا۔ "تم ہندو بھوٹڑی ہو۔"

"نہیں پشکر اب تو میں ہندو ہوں۔ اماں سے نہ کہنا۔ اچھا۔"

اسے شاید رحم آ گیا اور اس نے بڑے اہتمام سے چندن لگایا۔

عید پر میں نے بھی ساری کسر نکال لی۔ پشکر کو کافر کہہ کر اس سے فوراً لڑائی کر لی، مگر جب مہندی سے میرے ہاتھ پیر لال ہو گئے تو میں بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ آیا تو میں بے توجہی سے اپنے ہاتھوں کو گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

"ہاہا۔ منی کے ہاتھ بڑے لال کتر ہو گئے۔ دیکھیں منی۔"

میں نے اس کے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "ہٹو بھئی ہماری تو عید ہے کوئی تمہاری بھوٹڑی ہے جناب آپ کوئی روزے بھوٹڑی رکھتے ہیں۔ مسلمان جو روزے رکھتے ہیں تب ہی ان کی عید آتی ہے۔"

"تو کب روزے رکھتی ہے۔"

"واہ۔ میں ایک ڈاڑھ کا رکھتی ہوں۔"

"اونہہ بڑی رکھنے والی آئی۔ دن بھر تو بکر بکر کھاتی ہے۔ ایسے ایک ڈاڑھ کا میں بھی رکھ لوں گا۔"

"واہ تم ہندو ہو۔" میں نے آخری ترپ لگاتے ہوئے کہا۔

وہ کھسیایا ہو گیا۔ "تو اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"ہم کل نئے نئے کپڑے پہنیں گے۔" میں نے اترا کر کہا۔

"میں بھی اپنا نیا کوٹ پہنوں گا۔"

"واہ تم ہندو ہو، تم کیوں پہنو گے۔ ہم تمہیں اپنی سویاں بھی نہیں کھلائیں گے۔"

"اور ہماری دیوالی پر ڈھیر سی کھیلیں ٹھونس آئیں۔ ہم سے چندن بھی لگوا لیا۔ بابوجی سے کھلونے بھی ٹھگ لیے اور اب ایسی باتیں کرتی ہے۔ بے ایمان کہیں کی۔"

میں نے فوراً پشکر سے لڑ کر اُسے بھاگ جانے پر مجبور کیا، لیکن کپڑے بدلتے ہی مجھے اس پُر رعب گانٹھنے جانا پڑا۔

میں گوٹہ پٹھے کے کپڑے پہن کر غبارہ بنی ہوئی جب پشکر کے پاس پہنچی تو اس کا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا اور اُلٹی میری خوشامدیں کرنے لگا۔ مگر میں نے اُسے بار بار سمجھایا کہ وہ ہندو ہے اور اسے ہماری عید پہ خوش ہونے کا کوئی حق نہیں۔

وہ مایوس ہو کر کہنے لگا۔ "اچھا ہم بھی مسلمان ہوئے جاتے ہیں کہنا مت کسی سے۔"

مگر بے ایمان کہیں کا ہولی پر پھر کافر ہو گیا۔ اس کی بن آئی۔ اور میرے پیچھے لگے رہنے اور خوشامدیں کرنے کے باوجود اس نے مجھے رنگ کھیلنے سے صاف انکار کر دیا۔

"تو مسلمنٹی ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا پشکر عید پر آنا کیسا پیٹوں گی کہ یاد کرے گا۔" میں نے سر ہلا کر کہا۔

"تو پھر تو ہندو ہو جانا۔" پنڈت جی نے سر کو بے رُخی سے موڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو مجھے ابرق ملا ہوا گلال تو دو۔"

"تو تُو اس دن کہتی تھی کہ بدن کے جون جون حصے پر رنگ پڑتا ہے۔ دوزخ میں جاتا ہے اب رنگ کیوں مانگتی ہے۔"

"اب میں ہندو ہو گئی۔" میں نے قائل ہو کر کہا۔

"ہے بے ایمان ہر دفعہ ہندو ہوتی ہے اور پھر مسلمان ہو جاتی ہے۔ پہلے کہہ کہ اب کے سے مسلمان نہیں ہو گی۔"

"اچھا۔"

"اور مجھ سے شادی کرے گی۔ کیوں ہے نا؟"

میں نے یہ آخری شرط بھی مان لی اور عید تو عید میں محرم پہ ہی مشرف باسلا

ہو گئی اور پشکر کو یزبد کا بچہ کہا۔ کیونکہ وہ کافر اور دوزخی تھا۔

یہ پنڈت بھی کیا بھولی ذات ہے اور کشمیری پنڈت خصوصیت سے بس فرشتہ ہوتا ہے۔ ادھر میں پشکر کو مارتی اُدھر وہ ملاپ کر لیتا۔ بزدل اتنا کہ ذرا سے جو بکرے کٹے تو انہیں تڑپتا دیکھ کر رو دیا۔

"ارے تیرے ابا اتنے بکرے کیوں مار ڈالتے ہیں۔" اس نے بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھاڑ کر کہا۔

"ارے بے وقوف! یہ تو ثواب ہے۔" میں نے عالمانہ لہجہ میں کہا اور اس کے رونے کا مذاق اُڑایا۔

"ثواب ہے! — بکرے کا کاٹنا ثواب ہے؟"

"ہاں اور کیا — جب ہم جنت میں جائیں گے تو ان بکروں پہ سوار ہو کر پُل صراط پہ سے گزریں گے — پشکر ہم تو فٹافٹ چلے جائیں گے۔ اور تم رہ جاؤ گے۔"

"میں اپنی سائیکل پہ چلا جاؤں گا۔"

میں جل گئی — "واہ جناب پُل صراط بال سے بھی باریک اور تلوار سے بھی تیز ہے۔ تو دھڑام سے دوزخ میں گر پڑے گا اور ہم بکروں پہ ٹک ٹک کرتے چلے جائیں گے۔"

"میں تیرے بکرے پہ بیٹھ کر جاؤں گا۔"

"واہ ہٹ میں تجھے دھکیل دوں گی۔"

"میں خود تجھے گرا دوں گا۔"

"کیسے گرائے گا تو۔" میں نے اسے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

ایک چشم زدن میں وہ گرا کر دو چپتیں لگا چلتا بنا۔

چوڑیاں ٹوٹ جانے سے میرا کلیجہ پھٹ گیا۔ اور ایسی دہاڑی کہ باباجی اُسی وقت بازار سے چوڑیاں پہنوا کر لائے۔

نہ معلوم کتنی عیدیں اور ہولیاں گزر گئیں۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ خیالات بھی بدل گئے۔ ہم تو دونوں تو گویا مذہب کی فلاسفی ہی کو سمجھ بیٹھے تھے۔ ہولی پر پشکر آتا اور مجھے رنگ میں شرابور کر دیتا اور ڈھیروں گلال مل دیتا۔

جنم اشٹمی پر اس نے مجھے کرشن کا ایک مرمریں اسٹیچو دیا۔ جس کے پیروں کے قریب ایک چھوٹے سے فریم میں پشکر کی تصویر تھی۔ تصویر اور مجسمہ دونوں میری میز پر رکھے رہتے اور اکثر میری توجہ کا مرکز بن کر رہ جاتے۔

پشکر بنارس چلا گیا اور میں علی گڑھ۔ ہمارے اسکولوں کی چھٹیاں بھی مختلف زمانوں میں ہوتیں اور اب عید اور ہولی پر بھی ہم دونوں نہ ملتے خدا دسمبر کا بھلا کرے۔ سب کے لیے برابر سامانِ لطف لے آتا ہے۔ میں برآمدے میں لیٹی کچھ پڑھ رہی تھی کہ "مسلمٹنی" کی صدا نے مجھے پشکر کے آنے کی خبر دی۔ میں نے "کافر" کہہ کر اس کا استقبال کیا۔ اس نے میرے منہ پر گلال مل دیا۔

"ارے یہ دسمبر ہے ہولی!" میں نے اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ گلال میں نے تیرے لیے ہولی پر بچا کر رکھ لیا تھا تو مجھے سویّاں نہیں کھلائے گی؟"

"نہیں، تو تُو کافر ہے!"

"اور تُو کافرنی۔ تجھے اپنا ہولی والا بچپن یاد ہے۔"

"کون سا؟" میں نے چُندھیا کر کہا۔

"اب اترائی۔ تو نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ مجھ سے شادی کرے گی۔"

"ہشت بدتمیز!"

"کیوں بنتی ہے۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"سنا ہے مسولینی تم لوگوں پر بڑا ظلم توڑ رہا ہے۔"

"پشکر میری سانولی (کالی سی) رنگت پر ہمیشہ ہی چھینٹا کسا کرتا ہے۔"

"ولایتی چوہے تو اپنی خبر لے۔ سُنا ہے فی چوہا ایک آنہ جنگی سے انعام ملتا ہے۔"

میں نے اس کی گوری رنگت پر حملہ کیا۔

ہندو مسلم فساد کے کچھ ذکر پر میں نے اس سے کہا۔

"بھاگ یہاں سے بھئی تو ہندو ہے۔ کہیں چاقو وا تو نہ مار دے ر۔"

"تو ہی قصیلٹی ہے۔ میں تو بچارا بزدل۔ تو ہی سینکڑوں بکرے ہضم کر گئی۔"

"مگر پشکر تم بکرے نہیں، تم تو بیل ہو۔"

اس نے میرے بازو میں وہ زور سے کاٹا کہ میں تڑپ ہی تو گئی۔

"اگر تو اتنی کلو ٹی اُلٹا توا نہ ہوتی تو میں ضرور تجھ سے شادی کر لیتا۔"

"خیر پشکر میں اُلٹا توا تو نہیں ہوں۔"

"تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے شادی کر لوں جی۔" اس نے آنکھیں چمکا کر کہا۔

"چپ کافر!"

"جانتی ہو شعرا نے کافر کس کو کہا ہے؟"

"وہ کافر اور ہوتا ہے تُو تو گدھا ہندو ہے۔"

"کیا ہندو اور مسلمان گدھے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اور یہودی گدھے کیسے ہوتے ہیں۔"

ہم مختلف مذاہب کی مناسبت سے گدھوں کی اقسام پر بحث کر کے ہنسنے لگے۔

زمانہ گزرتا گیا۔ پشکر ڈپٹی کلکٹر ہو کر ہمارے قریب کے ضلع میں تعینات ہو گیا۔ اس کی موٹر اتوار کے دن گھس ڈالی جاتی تھی۔ اس نے کئی بار مجھے اپنا ہولی کا بچپن یاد دلایا۔ لیکن میں نے بے تکی بات کہہ کر زبان سے نکالنے کو بھی منع کیا۔

"آخر کیا تو مجھے یوں ہی ڈراتی رہے گی! میں آج ماں سے ذکر کروں گا۔ چاہے پھر غدر ہی کیوں نہ ہو جائے ڈرپوک کہیں کی۔"

"پشکر بڑے جوتے پڑیں گے۔ یاد رکھو ابا پیٹ پھاڑ ڈالیں

گئے۔"

"اجی ان باتوں سے نہیں ڈرتا لیکن یہ تو سوچو کہ آخر کب تک یہی سوچتے رہیں کہ آسمان سے ہماری مدد کو کوئی آئے۔"

"پشکر یہ تو سوچو کہ ہم کس قدر معیوب بات کر رہے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ مذہب!"

"اجی گولی مارو اس مذہب کو۔ مذہب ہمارے فائدے کے لیے ہے نہ کہ ہم اس کی قربانی کے لیے۔"

"تم ابا جان اور چاچا کی دیرینہ محبت کو دیکھو۔ ان کی جو بات شہر میں ہے اس پر غور کرو۔ ہماری شادی سے ان کی کیسی ذلت ہو گی۔ اخبار جنہیں کوئی ڈھنگ کا موضوع میسر نہیں۔ ہماری تصویریں، ہماری عشق بازی اور موجودہ تعلیم کی وہ درگت بنائیں گے کہ جینا دشوار ہو جائے گا۔ غیر مذہب میں شادی کرنا جرم ہی نہیں بلکہ ایک آفت ہے۔ ہماری قوم کے لڑکوں کو یہ اجازت ہے کہ وہ ہندو عیسائی جس سے چاہیں شادی کر لیں۔ لیکن لڑکیوں کو نہیں اور آج تک فخر سے کہا جاتا ہے کہ مسلمان لڑکی کو کبھی عیسائی سے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ نہ معلوم کہاں تک یہ فخر بجا ہے۔"

"لیکن میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے دوسرے مجھے تمہاری یہ شرط منظور نہیں۔"

"چونکہ میرے لیے تمہارے مسلمان ہو جانے سے کوئی فرق نہ ہو گا۔ تم جب بھی اتنے ہی پاجی رہو گے۔ پسند سے اور مذہب سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔"

"تو پھر تو ہندو ہو جا۔"

"ذرا سوچ سمجھ کر بات کر۔ ابھی جو میں کہہ دوں کہ مجھے مرتد بنا رہا ہے تو محلہ کے سارے قصائی تیری بوٹیاں کر ڈالیں۔ دوسرے اگر میں ہندو ہو جاؤں۔ تو ربّ کی ناک بھی نہ سلامت رہے۔"

"ہم غلام ہیں پشکرہ ہماری کوئی چیز ہماری کہلائی جانے کی مستحق نہیں ہم سوسائٹی کی ملکیت ہے۔ وہ جو کچھ چاہے، ہمارے ساتھ کر سکتی ہے۔ ہم اگر چاہیں تب بھی کچھ نہیں کر سکتے۔"

"یہ سب واہیات ہے میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہارے بھائی جو ایک بیوی کی موجودگی میں میم لے آئے۔ وہ عیسائی ہے۔ برابر میں نے اسے گرجا جاتے دیکھا اور تمہارے بھائی صاحب کو بھی۔"

"پشکرہ وہ میم ہے اور تو پنڈت۔ اور میں بقول تیرے مسلمنٹی۔ بس لگا لے حساب!"

پشکرہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ "میں سوسائٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دونگا سنتی ہو۔ ہم آج ہی سول میرج کر لیں گے۔"

"خواہ مخواہ بھینے سے کیا حاصل۔ تم جانتے ہو ابا کو کس قدر صدمہ ہو گا۔ اور تمہاری برادری تمہارا حقہ پانی بند کر دے گی۔"

"پھر کیا کریں۔ سچ بتا تو کہیں اس پاجی حمید سے تو شادی نہیں کر رہی ہے اور مجھے چکمے دے رہی ہے۔ یاد رکھ اس قدر پٹواؤں گا خان صاحب کو کہ بھول جائیں گے اور علاقہ الگ کورٹ کرا لوں گا۔ دیکھ اگر ہم یوں ڈرتے

رہے تو بس ہو چکی زندگی۔"

"تُو تو سچ مچ پاگل ہی ہے۔ سوچنے تو دے، شاید خدا کوئی راہ بتا دے۔"

"اب بتا چکا خدا راستہ۔ میں جو بتا رہا ہوں۔ کوتوالی کے قریب سے ہوتے ہوئے داہنے ہاتھ کو نکل چلو۔ وہاں سے بس سیدھی سڑک مل جاتی ہے۔"

"اور وہاں سے واپس آکر ابّا کا جوتہ۔"

"واپسی کیوں۔ وہاں سے سیدھے دورے پر چلیں گے۔"

"تو یہ مشہور ہو جائے گا کہ میں بھاگ گئی۔"

"نہیں، بلکہ میں تیرے ساتھ بھاگ گیا۔ اُٹھ جلدی ہاں۔ تجھے کچھ مہر وہر کیا ہونا ہے وہ چاہیے۔ میں رجسٹری کرا دوں گا۔"

"مہر میں خود تجھے دوں گی۔ میری تنخواہ تجھ سے ذرا سی ہی تو کم ہے۔"

"اچھا اُٹھ تو مہر دے۔"

"مگر جب جی چاہے گا طلاق دیدیں گے۔"

"یہ بھول ہے کہ تُو تو ہر وقت لڑتی رہتی ہے۔ گھڑی میں سات طلاقیں دے گی۔ چل جلدی۔ ساڑھی بدل لے۔"

"اور ربڑ کی ناک!"

"ٹھیک ہے بڑی ستواں سی لا دیں گے یہ تو ویسے بھی بالکل چپٹی ہے۔"

"تو میں نہیں چلتی۔" میں نے دروازے کو پکڑ کر کہا۔

"اپنے بس نہیں چلے گی۔" اس نے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر بعد ہم کوتوالی کی سڑک پر سیدھے ہاتھ کو بڑی سیدھی سڑک پر جا رہے تھے۔

"اب بھی لوٹ چلو۔" میں نے لپشکر کے کان میں کہا۔

"سچ مچ!" اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

میں نے سر ہلا دیا۔ خدا جانے نفی میں یا اثبات میں۔ اور لپشکر نے گردن پکڑ کر مجھے جھکول ڈالا۔

"کافر!" میں نے اس کی کلائی میں ناخن گڑو کر کہا۔

"شاعروں والا۔"

میں نے سر ہلایا۔ لیکن اس دفعہ اثبات میں۔

چنڑی کی ڈکی

نام نوان کا عبدالحیٔ تھا مگر دل والیاں انہیں پیار سے 'ہائے' کہا کرتی تھیں۔ وہ تھے بھی سر سے پاؤں تک حسین اور دل حسپ ہائے۔ گنی سونے کی طرح دمکتا رنگ، سورج کی کرنوں کو شرما دینے والے خم دار بال، گہری سبز آنکھیں ـــــ ایسی کہ ایک بار کوئی جی بھر کے ان میں جھانک لے تو جنم جنم گھنیرے جنگلوں میں بھٹکتا پھرے۔ میٹھی میٹھی مسکراہٹ ایک قہر کہ شہید ہونے کو جی چاہے۔ انہیں دیکھ کر خدا کی قدرت یاد آجاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا بڑی فرصت سے مزے لے لے کر انہیں گڑھا ہے۔

کم سنی ہی سے انہیں دل دکھانے کا چسکہ پڑ چکا تھا۔ گرد و نواح کی تقریباً سب لڑکیاں وقتاً فوقتاً دل ہار چکی تھیں۔ جس محفل میں چلے جاتے 'دل والیوں کے کشتیوں کے پشتے لگ جاتے۔ شوہر اپنی بیویاں سمیٹ کر چوکنے ہو جاتے۔ کنواریوں کی مائیں فوراً ان کی بہنوں اور ماں پر واری۔ صدقے

ہونے لگتیں ــــــ کالج ہی میں تھے کہ پیغام جھڑنے لگے۔ نوکر ہوتے ہی تو لوگوں نے یلغار بول دی۔ بہنوں کی سہیلیوں کی تعداد اس تیزی سے بڑھی۔ کہ شمار کرنا مشکل ہو گیا۔ دعوتوں پہ دعوتیں ہونے لگیں۔ ایک سے ایک تیکھی سلونی حسینہ مع گاڑیوں جہیز سے انہیں جیتنے پر تُل پڑی۔

اگر بزاز پچاس ساٹھ تھان کھول کر سامنے پھیلا دے تو عقل اوندھ جاتی ہے۔ انتخاب مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی حال بیچارے "ہائے" کا ہوا۔ کبھی ایک پسند آئی کبھی دوسری کبھی ایک ساتھ کئی کئی پسند آجاتیں ــ اور پھر سب جی سے اُتر جاتیں۔

کوئی ان کے مقابلے کی تھی بھی کہاں ؛ وہ تھے بھی حکم کا اِکا ــ ان کے سامنے کوئی پان کا اٹھا تھا تو کوئی نہلا دہلا۔ ویسے دل والیاں تو چوئے پنجے سے زیادہ نہیں تھیں۔ جانتی تھیں وہ ان کی دست رس سے باہر ہیں ـ مگر دل سے مجبور تھیں۔ انہیں دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے اور آنسوؤں سے تکیے بھگونے سے انہیں کون روک سکتا تھا۔

اور بےچاری عالمہ نری پان کی دُکی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اس کے سینے میں شاید دل نہیں تھا، کیونکہ اگر دل ہوتا تو وہ ضرور "ہائے" کے دودھ جیسے سفید پیروں تلے لوٹتا ہوتا۔ بدصورت انسان سے انہیں چڑ تھی۔ خاص طور سے عورت کو تو بدصورت ہونے کا حق ہی ان کے نزدیک نہ تھا ؟ ــ وہ کہتے تھے کہ اگر عورت حسین نہیں تو ہے ہی کیوں ؟ اسی لیے عالمہ کو دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جی بھر کے کالی، اوپر

سے سینک سلائی کہ سوئی کے ناکے میں سے گھسیٹ لو۔ مجسم معشوق کی کمر تھیں۔ لوگ ان کے والدین پر ترس کھایا کرتے تھے کہ نہ جانے کس جنم کی سزا بھگت رہے ہیں۔ یہاں اچھی بھلی حسین جہیز والیاں اٹھائے نہیں اُٹھتیں۔ یہ اللہ کی رحمت، اسے کون اللہ والا سمیٹے گا؟

سینک سلائی دھری تھیں، مگر صحت بنانے کا بڑا شوق تھا۔ روزانہ شام کو ریکٹ ہلاتی آ دھمکتیں برسوں سے بیڈمنٹن کھیلنے پر تُلی ہوئی تھیں۔۔ مگر مجال ہے جو ایک ہاتھ بھی مار جائیں، سارے کورٹ پر مکوڑے کی طرح اُول جلول پھدکا کرتیں۔ اس اناڑی پن پر جل کر ہائے فوراً ریکٹ پھینک کر دھم سے سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔

"ارے عبدالحئی صاحب اتنے جلدی تھک گئے!" وہ اپنی چھوٹی چھوٹی نکھیں ٹپٹپاتیں۔ لفظ عبدل سے ہائے کو چڑ تھی، جیسے اوپر کے کام کا چھوکرا۔

"ورزش کیجیے عبدالحئی صاحب ورنہ مو۔۔ ٹے تھل تھل ہو جائیں گے۔"

"شکر یہ آپ کی رائے کا عالمہ خاتون صاحبہ۔"

"پھر۔ ۔ ۔"

"ہاں پھر؟"

"کچھ نہیں۔" عالمہ ٹال گئی۔

"نہیں صاحب تکلف نہ کیجیے۔ کہیے نا۔"

"بے چاری دل والیوں کے خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔" عالمہ صرف ہی نہیں بد ذوق بھی تھیں۔

اس رات کسی کے حسین تصور میں غرق ہونے کی بجائے عبدالحیٔ غصہ سے پھنپھناتے رہے۔ "کالی مائی" نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے! کم بخت مری ہوئی چھپکلی! خدا قسم اُبکائی آتی ہے۔"

جب عالمہ کو معلوم ہوا کہ حیٔ اسے چڑی کی دُکی کہتے ہیں تو وہ گھری کی طرح مہین مہین آواز میں خوب ہنسی کہنے لگی۔ "چلو زندگی میں ایک بات تو عقل کی کہی۔"

دل والیاں ہائے کے بارے میں ایسی گستاخی کی باتیں سن کر لرز اُٹھتیں۔

"تمہارے سینے میں تو دل نہیں، جوتے کا تلا ہے۔" وہ جل کر کہتیں۔

"تلا بڑے کام کی چیز ہوتی ہے پاؤں میں کنکر نہیں چبھتے۔" عالمہ فلسفہ جھاڑتی۔

"کیا ارادہ ہے؟ کیا عمر بھر شادی نہیں کرو گی؟"

"کروں گی کیوں نہیں؟"

"اور محبت؟"

"محبت بغیر شادی کب ہوتی ہے وہ تو طلاق ہوتی ہے۔ کوئی بھلا آدمی ملا تو نہایت شاندار عشق کیا جائے گا پھر۔ . . . ."

"ہائے، کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ذکر بھلے کا آدمی کا تھا۔"

"تو وہ بھلے آدمی نہیں۔"

"توبہ کرو۔ بھلے آدمی تو کیا ان کو تو آدمی کہنا ہی دغابازی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔؟"

"عبدالحئی آدمی نہیں، معشوق ہیں! بھئی مجھ سے تو معشوق نہ جھیلے جائیں ارے کہاں میں نخرے اٹھاتی پھروں گی۔"

"تو تم سمجھتی ہو کوئی تمہارے نخرے اُٹھائے گا؟"

"ضرور اُٹھائے گا!"

"کون؟"

"جسے غرض ہو گی وہ نخرے اُٹھائے گا ہی۔"

"کبھی آئینے میں منہ دیکھا ہے!"

"روز دیکھتی ہوں اور آئینے سے پوچھتی ہوں، آئینے رہے آئینے! ہے کوئی دنیا میں مجھ سے زیادہ حسین، آئینہ کہتا ہے، اجی توبہ کیجیے۔" عالمہ اپنی بدصورتی کا خوب مذاق اُڑاتی۔

ایک نسخہ تھا تیر بہدف ہزار بار کا آزمایا ہوا۔ جس کے استعمال سے عبدالحئی ہمیشہ سرخ رو ہوئے تھے۔ اور وہ تھا عشق کے میدان میں دشمن کو للکارنا، اسے اپنے عشق میں گرفتار کر کے سسکا سسکا کر اس کا حلیہ بگاڑ دینا۔ سخت تگڑم بازی کی ضرورت ہوئی ہے۔ اس فن میں۔ یوں دھڑے لڑکیاں پہل کر کے عاشق ہونے کی عادی نہیں، پہلے ان پر عاشق ہونے کا مکمل ناٹک کھیلنا پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کا کھیل ناٹک ہی بن گیا تھا۔ پہلی لڑکی سے انہیں خود بخود عشق ہو گیا تھا۔ سولہ برس کے تھے وہ بھی اتنی ہی ہو گی

مگر انہیں شادی کے بازار میں ابھی آنے میں دیر تھی، چنانچہ دو سال بعد لڑکی کی شادی ہو گئی اور جب یہ برسرروزگار ہوئے تو وہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اس عرصے میں انہوں نے کئی عشق کیے۔ عشق کی مشق سے ان میں بڑی پختگی آئی۔ ایسے ایسے گُر انہوں نے سیکھے کہ خود کورے نکل آئیں، اور مقابل چت ہو جائے۔ ہاتھ اتنا صاف ہو گیا کہ پلک جھپکتے فتوحات حاصل ہونے لگیں، نظر بھر کے دیکھا، دو چار چھٹتے ہوئے جملے تُلی ہوئی آواز میں سرکائے گمبھیر ہری ہری آنکھوں سے پھندا پھینکا اور مال غنیمت سمیٹ کر چل نکلے۔"

مگر بدصورت لڑکیوں سے اظہار عشق کوئی کیسے کرے؟ بدصورت لوگ اپنے گرد چٹانیں کھڑی کر لیتے ہیں۔ تالا مضبوط ہو تو کانٹا ٹوٹ جاتا ہے کم سن بھولی بھالی حسینہ کو بہلانا تو انہیں آتا تھا اور کسے نہیں آتا؟ مگر عالمہ کی تو وہی مثل تھی، اونٹ رے اونٹ تیری کون سی سیدھی راہ بنانے کے لیے کوئی تو روزن چاہیے۔ کھڑ نجے سے سر پھوڑنا کہاں کی دانش مندی ہو گی!

ایسی بے بسی ان پر کبھی نہ چھائی تھی۔ ساری دل والیاں بھی تل کر اس ایک زخم کا مرہم نہ بن سکیں جو عالمہ کی اس قلعہ بندی سے رسنے لگا تھا انہوں نے بہت جال پھینکے، لیکن جلی کٹی بحثوں کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ سوچا ظاہری حسن کے ذکر سے کترا کر، کچھ روحانی حسن کا ذکر چھیڑا جائے مگر عالمہ فزکس میں ریسرچ کر رہی تھی۔ بھوت پریت سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ ویسے

وہ کچھ زیادہ باشعور اور خوش خو بھی نہ تھی۔ نہایت تُرش، کج بحث، آواز میٹھی تھی مگر باتیں کڑوی کسیلی۔

حسیٔ چِڑ گئے۔ کھسیانی بلی بن گئے۔ اب وہ مذاق میں قہقہے لگا کر اپنے امی سے کہتے "بھئی اس حسینہ "مہ جبیناں" کو ہمارا پیغام بھیج دو کہ ہم اس پر ایک چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو چکے ہیں۔

اے پری رو، رحم فرما! واللہ امی، لڑکی ذات یہ حرکتیں کرتی تو اماں کی ناک چوٹی کٹ جاتی۔ لیکن بیٹے کی ہر دل عزیزی پر وہ بھی پھولی نہ سماتی تھیں۔ جب کسی لڑکی سے پینگ بڑھاتے تو وہ بھی ہونے والی بہو پر عاشق ہو جاتیں۔ اس کے وہ چاؤ چوچلے کرتیں کہ توبہ۔ پھر جب حسیٔ اُکتا جاتے۔ اور ان کا رویہ بدل جاتا تو ماں کا عشق بھی یک لخت رفو چکر ہو جاتا۔ بہنیں بھی رُکھائی برتنے لگتیں۔ سچ ہے، وہی سہاگن ہے جس کو پیا چاہے۔ ایک دم اس کے خاندان سے کسی بات پر لڑ بیٹھتیں اور بیٹے کی پچ رکھنے کو کہہ دیتیں "اے بھئی اس لڑکی کے طور طریق ٹھیک نہیں چڑھ چڑھ کے ناحق آتی ہے۔" اس کے بعد جھٹ اُس لڑکی کی شادی ہو جاتیں یا کہیں دل کی مرمت کرانے روانہ کر دی جاتی اور نئی امیدوار کے سامنے ماں بہنیں مل کر خوب اس کا مذاق اُڑاتیں۔

"اے حسیٔ ذرا سیدھے منہ بات کر لیتا تھا تو اتار وہی ہو گئیں مجھے تو چھوٹی آنکھ نہیں بھاتی تھی۔" پھر سب مل کر کوئی نئی لڑکی پسند کرتیں۔ اس کا آنا جانا بڑھاتیں پھر سہرے کے پھولوں اور چڑھاوے کے سہانے ذکر

چھیڑتے۔ مگر عالمہ کے لیے مذاق میں بھی پیغام بھیجنے کا ذکر سن کر چاہت کی ماری امی سہم گئیں۔

"نا بیٹا، یہ مذاق پرائی لڑکی کا اُڑانا اچھا نہیں، جو اللہ نہ کرے انکے باوا نے قبول کر لیا اور ۔ ۔ ۔ "

"تو کیا ہوا! بس چاند سی بہو لاییے گا۔"

"مجھے ایسی باتیں ذرا نہیں بھاتیں ۔ ان کے باوا ویسے ہی خر دماغ ہیں۔"

"تو کیا ہم ان کی صاحبزادی کو گالی دے رہے ہیں پیغام ہی تو بھیج رہے ہیں۔"

"چل ہٹ دیوانے ۔ وہ تو سر آنکھوں پہ اُٹھائیں گے پیغام۔"

شرارت حد سے گزر جائے تو کمینہ پن بن جاتی ہے یہ مذاق کچھ اتنا بڑھا کہ بات عالمہ کے کانوں تک پہنچی۔ سب نے سوچا کہ سن کر رد ہی تو پڑے گی۔

مگر توبہ کیجیے جناب! عالمہ نے سنا تو کان پہ ہاتھ رکھ کر بولی، "نا بابا۔ میں کہاں جلیبیوں کی تھال پر سے ساری عمر مکھیاں اُڑاتی پھروں گی ۔ عبدالحئی صاحب ٹھہرے معشوق الٰہ میں کسی کا شوہر یا ۔ بچوں کا باپ بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔ مجھ جیسی بدصورت عورت کی بھی یہ سزا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا چھبیلا دولہا مجھے کیسے ہضم ہو گا؟"

"انگور کھٹے والی بات ہے ۔ ایسا حسین دولہا مل جائے تو ۔ ۔ ۔ "

دل والیاں کلس گئیں۔

"نا بھئی، میں کیا کروں گی حسین دولہا کا؟ کوئی مجھے کرائے پر چلانا ہے؟"

حیٔ نے سنا تو انار کی طرح چھوٹ نکلے۔ "بہت سوہے ہے کم بخت! صورت سے بڑھ کر دل کالا ہے۔"

ادھر عالمہ اپنے تھیسس پر لگی ہوئی تھی۔ بیڈ منٹن کبھی کا ختم ہو گیا تھا۔ اس کا ذکر بھی پھیکا پڑ چکا تھا۔ فضا گندر تھی۔ حیٔ نے بوکھلا کر دو تین اور ہاتھ مارے۔ ایک بت کافر پاکستان سے بھی آئی۔ مگر معلوم ہوا کہ مال اکسپورٹ کے لیے نہیں، ہاں دولہا کو امپورٹ کیا جا سکتا ہے مع امریکن فرم میں نوکری عالمہ نے سنا تو بلک اُٹھی۔ "ائے ہے انہیں اکسپورٹ کر کے چلغوزے منگوا لیے جائیں۔ اللہ کتنا فائدہ رہے گا قوم کا بھی فائدہ اور ملک بھی سرخرو۔"

دل والیاں لڑ پڑیں۔ انگور کھٹے اس لیے تھو تھو، جو مل جائیں تو ہپ ہپ۔

مگر عالمہ اپنی بات پہ اڑی رہی۔ عبدالحیٔ خاں کا وجود قوم اور ملک کے لیے فخر کی بات نہیں، ویسے عورت ذات کے لیے تو وہ زہر ہلاہل ہیں۔ وہ دلوں سے کھیلتے ہیں اور کھیلتے رہیں گے۔ بوڑھے کھوسٹ ہو جائیں گے پر یونہی میدان مارتے رہیں گے۔ نہ جانے کتنے گھر بگاڑ بن گے کتنوں کی بیویاں بھگائیں گے اور کتنوں کا دل خاک میں ملائیں گے۔

حیٔ نے سُنا تو خوب ہنسے۔

"دراصل عالمہ مجھ پہ بُری طرح عاشق ہے اسی لیے مجھے بدنام کر رہی ہے

کہ سب مجھ سے خوفزدہ ہو جائیں تو . . . "

اماں بہنیں تو عالمہ کو کوسنے لگیں۔ جل ککڑی مردار ۔ اور نئی امیدوار کے خواب دیکھنے لگیں ۔ ہے ہے لوگو غضب ہے کہ نہیں ۔ شہزادوں کو شرما دینے والی صورت شکل، کماؤ پوت اور کنوارا بیٹھا ہے ۔ کبھی دیکھا نہ سنا۔

علید صاحب، فزکس کے پروفیسر عالمہ کو تھیسس لکھنے میں مدد دیتے تھے۔ چالیس پینتالیس برس کے ہوں گے بیوی کچھ سال ہوئے' دو بچے چھوڑ کر مر چکی تھی۔ ان کی طرف سے عالمہ کے لیے پیغام آیا جو منظور کر لیا گیا۔ عالمہ کی بھی مرضی تھی ۔

حیٔ نے سنا تو قہقہوں سے گھر سر پر اٹھا لیا۔

"رام ملائی جوڑی، ایک اندھا ایک کوڑھی ۔ چلو دو گھر نہیں بگڑے۔"

جب شادی کی مبارکباد دینے گئے تو یوں ہی کہہ دیا ۔ "مگر آپ نے بھی کس بور سے شادی کا فیصلہ کیا ہے ۔"

"خیر زیادہ بور تو نہیں ۔"

"بہت زیادہ بور ہیں۔ دوسرے ان کی شکل نہایت خطرناک ہے، گنجے الگ ہیں ۔"

"مجھ سے بھی زیادہ خوفناک شکل ہے ؟"

"قطعی، ان کے سامنے تو آپ حسین ہیں ۔"

"سچ ؛ بس تو پھر اس سے بہتر جوڑ کہاں ملے گا۔ دلہن سے زیادہ حسین ہونا

چاہیے۔" عالمہ چہکی۔

"بڑھے الگ ہیں۔"

"دلہن کو دولہا سے کم سن ہونا چاہیئے۔"

"آپ کو ان سے محبت ہے؟"

"آپ کون ہوتے ہیں یہ پوچھنے والے؟"

"آپ تو جانتی ہیں محبت میری ہابی ہے اس لیے۔۔۔"

"او۔۔۔ تھیسس تیار کر رہے ہیں؟" عالمہ ہنس پڑی۔ "ہو سکتا ہے؟"

"میری تھیسس ٹائپ ہو کر آجائے تب۔۔۔"

"فرصت سے عشق کا پروگرام بنے گا۔" حمی نے لقمہ دیا۔

"ایں؟ خیال برا نہیں۔"

"باقاعدہ پروگرام بنا کر۔ حمی بھنا اٹھے۔ "معاف کیجیے گا یہ نہایت چغد پن کی بات ہے۔۔۔ ایسے محبت کی جاتی ہے؟۔ گویا یہ بھی تھیسس ہو گئی۔"

"کیوں؟ وہ آپ اکسپرٹ ہیں نا۔ ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ تو آپ کی قیمتی رائے سے اگر مستفید ہو سکوں تو۔۔۔ ویسے کچھ آپ سے سیکھا تو بے اندازہ کچھ مشکل کام نہیں۔ آپ تو مشاق ہیں کھٹا کھٹ پانچ منٹ میں میدان صاف۔" عالمہ نے چٹکی بجا کر کہا۔

"آپ قطعی اناڑی ہیں۔"

"اونہہ کوئی مضائقہ نہیں۔ عبید صاحب کچھ عشق وشق کے ساتھ دلچسپی نہیں رکھتے۔ نہایت پریکٹیکل قسم کے آدمی ہیں۔"

"آپ ان کے ساتھ خوش رہ سکیں گی؟"

"خوش رہنا اتنا مشکل کام نہیں ۔۔۔ اپنا نجی فعل ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے غریبی ۔۔۔ بدصورتی ۔۔۔ بُری صحبت ۔۔۔ کوئی بلا بھی مجھے آج تک پست نہ کر سکی۔ مجھے یقین ہے میں بہت خوش رہوں گی۔"

"یہ شادی نہیں ہو گی!"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ عشق کی ہتک کر رہی ہیں۔"

عالمہ اور عبید صاحب کی شادی نہیں ہو سکی ۔۔۔ حسیٰ نے عبید صاحب سے جا کر صاف صاف کہہ دیا کہ عالمہ ان سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیوں؟" عبید صاحب بھونچکے رہ گئے۔

"کیونکہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔"

"میں؟ کس سے؟"

"مجھ سے!" حسیٰ نے مسکین صورت بنا کر آنکھیں جھکا لیں۔

"مگر... مگر آپ!"

"جی ۔۔۔" حسیٰ نے گردن جھکا لی۔

حسیٰ کے جانے کے بعد عبید صاحب کو یقین ہو گیا کہ عشق واقعی اندھا ہوتا ہے۔

گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی . . . . . . مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

"اس غریب کی زندگی برباد کر کے تجھے کیا ملا؟" اماں نے آنسو بھر کر کہا۔ "اس بدنامی کے بعد اب نگوڑی کو کون قبول لے گا؟"

"میں ہی بھگتوں گا کم بخت کو۔" حیئ نے منہ لٹکا لیا عالم نے طوفان سر پہ اٹھا لیا۔

"قیامت ہو جائے میں اس پگلے سے شادی نہیں کروں گی۔ اس لیے مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے کہ سب عورتیں اس پر رحم کھا کر مہربانیاں کرتی رہیں۔"

"پگلا کیسے ہوا؟" لوگوں نے پوچھا۔ "تمہیں پسند کرتا ہے اس لیے؟"

"ہاں اسی لیے مجھ میں ایسی کون سی بات ہے جو کوئی باہوش وحواس انسان پسند کرے۔"

کیا کیا ہنگامے ہوئے۔ خودکشیوں کی دھمکیاں چلیں۔

"ہائے تجھے تو چڑی کی دُکی سے گھن آتی تھی۔" اتا بلکیں۔

"وہ تو آتی ہے اور آتی رہے گی۔"

"پھر تجھے کیا ہو گیا ہے میرے لال — کیوں اپنی زندگی مٹی میں ملا رہا ہے۔؟"

کالی مائی نے جادو کر دیا ہے"۔ حیئ نے مسکین صورت بنا کر کہا۔ اور بڑی دھوم دھام سے اپنی زندگی مٹی میں ملا دی۔

• دیکھ لینا چار دن میں طلاق دے کر میکے پھنکوا دے گا۔ سب نے پیش گوئی کی۔

• آج اس "حادثے" کو گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ اس بے ہنگم جوڑے کو دیکھ کر دل سے ایک لمبی چوڑی ہائے نکل جاتی ہے۔

سچ ہے چڑی کی دُکی اگر ٹرپ کی ہو تو حکم کا اِکا کٹ جاتا ہے۔

تاریکی

چاند کی آخری تاریخوں میں —— جب چاند غائب ہو جاتا ہے — اور
ﻤگادڑیں بھٹے لگاتی ہوئی سیاہ فضائیں غوطے لگاتی ہیں۔ مجھ پہ ایک جنونی
ﺒفیت طاری ہو جاتی ہے۔

"آموں والے باغ کے پیچھے!"

اس دن میرے کانوں میں کوئی گنگنا رہا تھا۔ لیکن پھر وہی۔ کہیں یہ
اسی کی طرح نہ چڑکر ؟— خیر۔

مَیں نے یوسف سے کہا۔ "یار میری آواز بنا کر حاضری بول دینا، اور
ﮪا اسٹیشن کی طرف اُڑا۔ ابھی گیارہ بجنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میرے
نہ جانے کیوں کانپ رہے تھے، میں نے چڑکر دو پیگ اور پی لیے اور
ﻠک ویٹنگ روم کے سامنے ٹہلتا رہا۔

ٹھنا ـــــــ ٹن ۔" گیارہ کا گھنٹہ ایک ٹھن کی طرح میرے کلیجہ پہ پڑا۔
دو دفعہ پیر پیڈل پہ سے پھسل کر واپس سیڑھی سے ٹکرایا۔ تیسری کوشش میں
دوسری طرف گرتے گرتے بچا۔ آج سائیکل بھی زور دکھا رہی تھی۔ جیسے اُسے
میری کمزوری کا پتہ چل گیا ہو۔ ہوا ایک بپھری ہوئی ناگن کی طرح میری سائیکل
کے پہیوں سے زور آزمائی کر رہی تھی۔ آگے کا پہیہ مست شرابی کی طرح جھوم
رہا تھا۔ میں سائیکل سے چمٹ جانا چاہتا تھا۔ ڈگی والی سڑک سے ہوتا ہوا
داہنے ہاتھ والی کچی سڑک پر مڑ گیا۔ دھول اور گڈھے، شام کو گزرنے والے
مویشیوں کی غلاظت، ان سے بچتا ہوا دودھ پور کی سڑک پر نکل گیا "آئے گئے
بابو جی!" اس نے پلیا سے نیچے رینگ کر کہا۔ "اوں۔ کب سے ٹھاڑھ ہن ۔"
وہ روٹھنے کے انداز میں بولی۔

میں نے سائیکل کو پیڑ سے لگا کر ڈال دیا۔ اور ایک راجے کی طرح پلیا
پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر اندھیرے میں میری آنکھیں اندھیرے
ڈھونڈنے لگی۔ مگر رات اندھیری تھی ۔" ارے تجھے ٹھنڈ نہیں لگتی ۔ میں نے
اندھیرے ہی میں اُسے ٹٹولا۔ وہ گرم پانی کی بوتل کی طرح گرم اور پسیجی ہوئی
تھی اس نے صرف ایک گہری سانس لی اور ہنس دی ۔

"اُہنوں!" میں نے پسینے، باسی کھانے اور خاک دھول میں بسے بھبکے
سے بولا کر کہا "چڑیل!"

"کا کریں۔" ہی ہی ہی ۔ وہ پھر ہنسی اور اپنے سر کو کھجانے کی کوشش
کرنے لگی۔ بالوں کا جال۔ سڑے ہوئے تیل، خاک اور میل میں گندھے ہوئے

سر پہ ایک ٹوپی کی طرح منڈھا ہوا تھا۔ مگر پلیا کے نیچے سڑنے والے پتوں کی گمک آم کے تازہ تازہ بور کی خوشبو۔ خود اس کے جسم کی بساند مل جل کر مجھے بد حواس کرنے لگی۔ اس کا بات بات پہ کھلکھلا نا۔ کانسی کے کڑوں کی جھنکار۔ میں سب کچھ بھول ۔۔ دور فضا میں چمگادڑ نے قہقہہ مارا۔ میری پیٹھ پہ کھنکھجور سے رینگنے لگے۔ ہوا دق کے مریض کی طرح لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہی تھی ۔ رات کی کالونچ اور گہری ہوگئی ۔

جب میں لوٹا تو صفیہ کے کمرے میں ابھی تک لالٹین جل رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ زینے پہ چڑھنے لگا۔ لیکن شاید وہ جاگ گئی۔ کیونکہ روشنی غائب ہوگئی۔ میرا سر جھک گیا۔

"صفو !" میں نے صبح اسے پیار سے کہا۔

"ہاں بھیا ۔" وہ دوپٹہ اوڑھتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ اس کی آنکھوں سے رات کو جاگنے کے آثار صاف ظاہر تھے۔ ہلکی سی زردی کی جھلک اور آنکھیں جھکی ہوئی۔ میرا جی چاہا کہ دوڑ کر اس کے پیر پکڑ لوں۔ میری ننھی سی بہن جو بیک وقت میرے لیے ماں، بہن اور خادمہ کی خدمت انجام دیتی تھی۔ اُف ۔ کس قدر پاجی ہوں میں بھی ۔ میں سر جھکائے چائے پیتا رہا۔ اور وہ میرا سوئیٹر بنتی رہی ۔

میں نے زینے پر چڑھنے میں ایک دھاری دار قمیض سے ڈھکا ہوا

کندھا دیوار کے بالکل قریب دیکھا۔ جو فوراً غائب ہو گیا "ہیں!" میں اُچھل پڑا۔ "یہ کمینہ جھانکا کرتا ہے۔" میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے صفیہ سے کچھ نہ کہا۔ وہ باورچی خانہ میں انگیٹھی پہ جھکی ہوئی کچھ تل رہی تھی میں پلنگ پہ بیٹھ کر بوٹ کے تسمے کھولنے لگا۔

نہ جانے کیوں۔ میں جس وقت بھی گھر میں گھستا، میری آنکھیں بے اختیار اس دیوار کی طرف اُٹھ جاتیں جو ہمارے پڑوسیوں اور ہمارے درمیان کھنچی ہوئی تھی اور جس نے ایک گھر کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے دو خاندانوں کے رہنے کا انتظام کر دیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی ادھر سے جھانک کر ہمیں دیکھا کرتا ہے، میرا شبہ یقین کو پہنچ گیا، جب کہ میں نے دھاری دار قمیض والا کندھا دیکھنے کے بعد ایک روز موٹی موٹی بھووں والی پیشانی کا کچھ حصّہ اور گچھے دار مردانہ بالوں کی جھلک دیکھی۔ اور پھر ایک روز چار مضبوط بھوری اُنگلیاں دیوار پر تھوڑی دیر جمی رہنے کے بعد غائب ہو گئیں۔ کوئی تیزی سے دیوار کے پاس سے ہٹا۔ میرا سر گھومنے لگا۔ اور فوراً میری نگاہیں صفیہ پر گئیں۔ وہ بالکل بے خبر دھوپ میں پھیلی ہوئی ساڑھی کو الگنی پہ سے گھسیٹ کر اُتار رہی تھی۔ شکر ہے کہ اس نے بدمعاش کو جھانکتے نہ دیکھا۔ ورنہ اس کے دل کو سخت رنج پہنچتا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ آج ان لوگوں کو ٹھیک کر دوں گا۔ لفنگے کہیں کے۔ بدمعاش!

ادھر سے یہ تنا تانا تو معمول ہی گیا کہ آموں والے باغ میں بور جھڑا آم

لگے اور پک گئے ۔ امتحان ایک طوفان کی طرح ٹوٹ پڑے۔ کہاں کا آموں کا باغ اور کہاں کی اندھیری راتیں۔ جدھر دیکھو دو چار سر کتابوں پہ جھونکے لے رہے ہیں۔ پھٹی ہوئی بے رونق آنکھیں۔ کھلی ہوئی جمائیاں۔ دبی ہوئی انگڑائیاں۔ گاڑھی چائے کی بھی بس کی نہ تھیں۔ طالب علم کی زندگی میں سال میں دو ہی تو کٹھن وقت ہوتے ہیں ۔ ایک تو امتحان سے کچھ پہلے شب بیداری اور دوسرا نتیجے کے وقت ۔ خدا کی پناہ! سب سنہری تو بھول کر میں بھی اسی طوفان میں بہہ گیا۔

نیا سیشن نئی صورتیں اور نئی دلچسپیاں لے کر آیا۔ اور پھر وہی ہم ۔ وہی پروفیسروں کی غیر دلچسپ آواز۔ وہی جیسا چودہ برس سے ہم دیکھتے آئے تھے۔ وہی سامنے کالا کالا بورڈ۔ میز کرسی اور پروفیسر۔

جب میرس روڈ کے چکر لگاتے لگاتے ٹانگیں شل ہو گئیں۔ گرلز کالج کی ہر ہوا خوری کی دلدادہ اُستانی کو ہر ممکن زاویہ سے دیکھ کر ان پر ہر قسم اور لے کے شعر پڑھ چکے تو اسٹیشن ہی سکون اور دلچسپی کی جگہ رہ گئی۔ لہذا حسب معمول وہاں کا رُخ کرنا پڑا۔ وہاں سے کم پی کر زیادہ ظاہر کرتے ہوئے جیسے ہی میں اور یوسف سیڑھیوں کے قریب پہنچے پیچھے سے کسی نے کہا۔

" بابو جی !"

اور یقین مانیے وہ مع اپنی گل لیانہ اور بدبو کے موجود تھی ۔

" مائی۔" اس نے گودڑ کی ایک پوٹلی کو کریدتے ہوئے اشارہ کیا۔ جیسے کسی نے مجھے پیچھے گھسیٹ لیا۔ "چر۔ ریں" ایک بہت حقیر انسانی کیڑے نے کلبلا کر سوکھی ہوئی مٹھیاں ہوا میں اچھالیں۔ وہ فاتحانہ مسکراہٹ سے کبھی اس کینچوے کو اور کبھی مجھے دیکھتی رہی۔

" اہیں ۔ یہ ٹھاٹ ہیں۔ !" یوسف نے قہقہہ لگایا۔

" بابوجی !" اس نے مجھے پھر پکارا ـــــ مگر ہم پیڈل مار کر نکلے چلے گئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ـــــ وہ ایک تانگے کے پیچھے چیختی چلاتی بھیک کے لیے دوڑ رہی تھی۔ گودڑ کی پوٹلی میں سے دو ٹانگیں ۔ سرخ سوکھی ہوئی ٹانگیں لٹک رہی تھیں۔ موڑ میں موڑ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ آگے سڑک سنسان اور تاریک تھی۔

جب میں پلنگ پر لیٹا تو ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کی ہر چیز گھوم رہی ہے اور ـــ وہ دو سرخ خونی ٹانگیں میرے سامنے بے کسی سے جھول رہی تھیں۔ صرف دو ٹانگیں۔ دہکتے ہوئے لوہے کی دو سلاخوں کی طرح میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔ میں نے بچنے کی کوشش نہ کی۔ گھس جاؤ کم... میرے دماغ میں۔ اُف کتنا اندھیرا تھا کمرے میں !

صبح ایک عجیب ذہنی دکھن نے مجھے پست کر دیا تھا۔ میں اپنی کمزوری پر جھنجلا اٹھا ـــ " اونہہ ! آخر میں ہی کیوں اس قدر حساس ہوں، ہونے دو ـــ کیا ہوا پھر ؟ ـــ یہ سب کمزوری ہے ـــ کمزوری ـــ یعنی اس میں

بات ہی کیا ہے، کون سا غضب ہو گیا! اور کیا ایک میں ہی ہوں!"
مگر میرا جی چاہا۔ کوئی اس چبھن کو جو ایک سیسے کی گولی کی طرح میرے دماغ میں کانوں کے ذرا پیچھے اڑی ہوئی تھی۔ نکال دے مجھے پھر غصہ آیا۔
اپنی کمزوری پہ ---- میں کالج سے جلد ہی لوٹ آیا۔ صفیہ اداس اور خاموش بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر جیسے ڈر کر چونک پڑی۔ میں بڑی دیر تک اس سے پیار کی باتیں کرتا رہا۔

"تمہارا نام لکھوا دوں گا اسکول میں۔" میں نے کہا:
"وہاں میری کلاس میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہوں گی۔ مجھے شرم آئے گی۔"
وہ پریشان ہو کر بولی۔ گو ہمیشہ سے وہ پڑھائی کی شوقین تھی۔
"تو کیا ہوا!" میں ہنسنے لگا۔

"وہ چھیڑیں گی۔" اس نے گھبرا کر کہا۔ نہ جانے اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد کیوں تھا۔ کمزور اور نحیف۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح تو اُسے بہلاؤں وہ کس قدر اُداس اور خوف زدہ تھی۔ میں نے دیوار کی طرف دیکھا۔ شکر ہے کہ وہاں سے اب کوئی نہیں جھانکتا۔ مکان دو مہینے سے خالی ہو چکا تھا۔ میں اطمینان سے کالج چلا گیا۔
زینے پر چڑھتے ہوئے مجھے کسی کی گھٹی ہوئی آہ سنائی دی۔ میں خاموش کھڑا ہو گیا۔ پھر وہی آہ ---- جیسے کوئی چیز میرے پیروں کے نیچے دبی تھی اور میرے چلنے سے کچلی جاتی تھی۔ ایک اور سی آہ۔ اور میں تیزی سے اوپر پہنچ گیا ---- تھوڑی دیر برآمدے میں کھڑا رہا۔ "آہ" صفیہ

کے کمرے میں سے! ـــــ میں جلدی سے چلا ـــــ "صفیہ ـــــ صفو!" ـــــ میں نے پکارا ـــــ وہ پلنگ پر لیٹی کیا آڑی پڑی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر اس نے جلدی سے رضائی اوڑھ لی اور گٹھری بن کر پڑ رہی ـــــ تکلیف اس کے چہرے ٹپک رہی تھی ـــــ دیکھ سے اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ اور اس نے اس طرح مجھے ڈر کر دیکھا گویا کوئی جن یا دیو ہوں میں کہ اسے کھا جاؤں گا۔ میں اس کے پلنگ پہ بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا صفیہ! کہاں ہے درد؟ کیا بخار ہے؟ میں نے اس کی پیشانی پر سے بال سمیٹے۔

وہ تکلیف کی وجہ سے کچھ نہ بول سکی ـــــ مگر اس نے گہری گہری سانسیں لینا شروع کیں اور بل کھا کر تکلیف کو چھپاتی رہی۔

"اونہہ ـــــ یہ رضائی کو اتار دو ـــــ کس قدر گرمی ہو رہی ہے افوہ! ـــ"

اور وہ رضائی کو زور سے پکڑ کر اوندھی ہو گئی۔ اس نے گھٹی ہوئی آہ کو اور دبایا ـــ میں بری طرح گھبرا گیا ـــ یا اللہ! وہ ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح اکڑ اکڑ کر تڑپ رہی تھی۔

میں نے جلدی سے سائیکل اٹھائی اور کالج کی طرف اڑا ـــ ڈا ڈیوٹی پہ تھے ـــ نفیس کہیں باہر گئے ہوئے تھے ـــ اور میرے

پیر کانپنے لگے ـــــ صفیہ کی معصوم شکل آنکھوں میں پھرنے لگی ۔ میں نے دیکھا بھی نہیں۔

کتنے دن سے وہ سست اور بیمار نظر آتی تھی ۔ حد ہوتی ہے لاپرواہی کی بھی ـــــ میں ملامتیں کرتا زناٹے سے چلا ـــــ رمیش بھی موجود نہ تھے ـــــ مس نیوز لیڈی ڈاکٹر ـــــ میں تیزی سے گھسا چلا گیا ـــــ کم بخت سینما جارہی تھی ـــــ میں نے کچھ ایسا بولایا کہ فوراً تیار ہو گئی ـــــ میں نے پتہ بتایا اور چلا موٹر کے پیچھے ـــــ میرا دل چاہتا تھا پیروں میں انجن لگ جائے اور کسی طرح موٹر سے آگے نکل جاؤں ـــــ معلوم تھا پیچھے کھسک جاؤں گا، خیر ۔ ! ـــــ

وہ اندر گئی اور مجھے باہر روک دیا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ سامنے لالٹین سسکیاں لے رہی تھی۔

"اوہ ـــــ آپ لوگ ـــــ کتنا بیوقوف ـــــ جلدی کیجیے ـــــ فوراً جائیے، ڈلسی کو بولیے بڑا بکس لے کر آئے ۔" اس نے واپس آکر کہا۔

"مس صاحب ۔" میں نے کہا۔

"بس ـــــ چلیے چلیے جلدی کریئے ـــــ جب کیس بگڑ جاتا ہے تو ہمارے پاس آتا ہے آپ ـــــ اور کوئی سامان بھی نہیں آپ کا پاس لیا جنگلی ہوتا۔ ہندوستانی لوگ ۔" مجھے کھڑے دیکھ کر وہ پھر دہاڑی۔ "آپ کا بیگم صاحب کا جان ڈینجر میں ہے ۔ آؤ اور آپ ۔"

"میری بہن ۔ مس صاحب ۔" میں نے جھینپ کر کہا۔ بے ہودہ کہیں کی! جی چاہا تھپڑ دوں ۔

"وہ کوئی بھی ہے ۔ بچہ مر چکا ہے اور لڑکی بے ہوش ہے ۔ آپ ۔ جلدی ۔"

سنن سنن ۔ جیسے گولیاں چلیں، دور جمگادڑ نے ایک کریہہ قہقہہ لگایا۔ ۔ اور غوطہ مار کر میرے اوپر سے نکل گئی ۔ دروازے کی چوکھٹ اچھل کر میرے ماتھے پر لگی ۔ اور پھر ۔ تاریکی !

میرا دوست میرا دشمن!

اڈلفی چیمبر کی چوبی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی جیسی
امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں
گھبراہٹ ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہاں تو وہ "نیا آدمی" منٹو تھا۔ جس سے پہلی بار ملنے
رہی تھی۔ میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاہد سے کہا۔ "چلو
پس چلیں شاید منٹو گھر پہ نہ ہو۔" مگر شاہد نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

"وہ شام کو گھر ہی پہ رہتا ہے۔ کیوں کہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔"

یہ لیجئے مرے پہ سو دُرّے ایک تو منٹو، اور وہ بھی پیتا ہوا منٹو۔ مگر میں نے
لڑا کر لیا۔ ایسا بھی کیا۔ مجھے کھا تو نہیں جائے گا! ہونے دو جو اس کی زبان کی نوک پر
نمک ہے۔ میں نمکین تو ہوں نہیں جو پھر نمک ماری تو میٹھا جاؤں گی۔ چرچراتی گرد آلود
حیاں طے کر کے ہم دوسری منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ روم نما
سے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سفید اور صاف

پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لدی پھندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک کمزور سے کی شکل کا انسان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

"آئیے آئیے" بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ منٹو ہمیشہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا۔ لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھینچ کر اس کا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا اور بعض وقت جب منٹو یوں رینگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر کھدر کا کرتہ پاجامہ اور جواہر کٹ صدری تھی۔

"ارے میں سمجھتا تھا آپ نہایت کالی ڈبلی سوکھی مریل سی ہوں گی۔" اس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

"اور میں سمجھتی تھی۔ آپ نہایت دینگ قسم کے" گلہ جھنگھارتے ہوئے پنجابی ہوں گے۔" میں نے سوچا رسید دیتے چلو کہیں یہ ایک دم نہ ہاپیٹے پر لے لے۔

اور دوسرے لمحے ہم دونوں پوری تندہی سے جٹ کر بحث کرنے لگے کہ جیسے اتنے عرصے ایک دوسرے سے ناواقف رہ کر ہم نے بڑا گھاٹا اٹھایا ہو اور اسے پورا کرنا ہو۔ دو تین بار بات الجھ گئی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا۔ لہٰذا دوسرے ملاقات کے لیے اٹھا رکھی۔ کئی گھنٹے ہمارے جبڑے مشینوں کی طرح مختلف موضوعات پر حملے کرتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو بھی بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سننے سے پہلے ہی بول اٹھتا ہے اور جو رہا سہا تکلف تھا۔ وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں نے بحث اور بحث نے باقاعدہ نوک جھونک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت ادبی قسم کے لفظوں میں احمق جھکی اور کج بحث کہہ ڈالا۔

گھمسان کے بعد میں میں نے ایک بار کنارے ہو کر غور سے دیکھا۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھیں جنہیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پر یاد آ گئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ ہے؟ یہ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ مگر جب بھی میں نے ان آنکھوں کو دیکھا مجھے مور کے پَر یاد آ گئے۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بے ساختہ شگفتگی مجھے مور کے پروں کی یاد دلاتی تھی۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انہیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قہقہہ لگاتے سنجیدگی سے مسکراتے۔ طنز کے نشتر برساتے اور پھر نزع کے عالم میں پتھراتے! وہی نازک ہاتھ پیر سر پہ ٹوکرا بھر بال پچکے زرد زرد گال اور کچھ بے تکے سے دانت۔ پیتے پیتے اچانک منٹو کو اچھو لگا اور وہ کھانسنے لگا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کھانسی تو جانی پہچانی سی تھی۔ اسے تو میں نے بچپن سے سنا تھا مجھے کوفت ہونے لگی نہ جانے کس بات پر میں نے کہا۔

"یہ بالکل غلط" اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے"

"آپ کج بحثی کر رہی ہیں"

"حماقت ہے یہ"

"دھاندلی ہے عصمت بہن"

"آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں"، میں نے چڑ کر کہا۔

"بہن یونہی، ملموماً میں عورتوں کو بہن کم کہتا ہوں۔ میں اپنی بہن کو بھی بہن نہیں کہتا۔"

"تو پھر مجھے چڑانے کو کہہ رہے ہیں"

"نہیں تو دیکھے جاتا آپ نے؟"

"اس لیے کہ میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلاتے چڑاتے اور مارتے پیٹتے رہے۔ یا پکڑ کر جھولتے رہے۔" منٹو زور سے ہنسا۔

"تب تو میں ضرور آپ کو بہن ہی کہوں گا۔"

"تو اتنا یاد رکھیئے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے۔ اس کا علاج کیوں نہیں کرتے ہو؟"

"علاج؟ ڈاکٹر گدھے ہوتے ہیں۔ تین سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے۔ تمہیں ٹی بی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ میں نے مر کر ان کی پیشگوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دیا اور اب تو بس میں ڈاکٹروں کو احمق سمجھتا ہوں۔ ان سے تو مسمریزم اور جادو کرنے والے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔"

"یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔"

"کون بزرگ؟"

"میرے بھائی عظیم بیگ، نو من مٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر ہم عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے۔ آئے تھے صرف ملاقات کرنے، لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے۔ شاہد جو ہماری جھڑپیں الگ تھلگ بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ بھوک سے تنگ آ چکے تھے۔ ملاڈ پہنچتے پہنچتے ایک بج جائے گا۔ لہٰذا کھانا کھا ہی لیا جائے۔ منٹو نے مجھ سے الماری سے پلیٹیں اور چمچے نکالنے کو کہا اور خود ہوٹل سے روٹی لینے چلا گیا۔

"ذرا اس برنی سے اچار نکال لیجیے۔" منٹو نے تیزی سے میز پر کھانا لگایا اور

رسی پر، کرسوں بیٹھک وہی میز جو دم بھر پہلے ادبی کارگزاریوں کا میدان بنی ہوئی
تھی۔ ایک دم کھانے کی میز ذریات انجام دینے لگی اور بغیر کسی سے پوچھے آپ
کھے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے
عادی ہوں۔

کھانے کے بیچ میں گرما گرم مباحثہ چلتا رہا۔ گھوم پھر کر منٹو "لحاف" کے بخیے
ادھیڑنے لگتا، اور میری دکھتی رگ بنا ہوا تھا۔ میں نے بہت ٹالنا چاہا۔ مگر وہ ڈھٹائی
سے اڑا رہا اور اس کا ایک ایک کر کے ملا ڈالا۔ اسے بڑا دھکا لگا۔ یہ سن کر کہ
"لحاف" لکھنے پر افسوس ہے۔ خوب جلی کٹی سنا ڈالیں اور مجھے نہایت بزدل
رکم نظر کہہ ڈالا۔ میں "لحاف" کو اپنا شاہکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور منٹو مُصر
تھوڑی ہی دیر میں "لحاف" سے بھی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی نہایت
کر۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بیہودہ سے بیہودہ بات
مزے اس معقولیت اور بھولپن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں
تی یا وہ مہلت دیتا ہی نہیں۔ اس کی باتوں پہ ہنسی آ جاتی ہے۔ گھن یا غصہ نہیں آتا
چلتے وقت اس نے پھر صفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے اور منٹو کو صفیہ کی یاد
کئی بار ستایا۔

"صفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔"

"آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

"بہت یاد آ رہی ہے۔ تو اسے بلا کیوں نہیں لیتے"، میں نے کہا۔

"ارے!..... کیا سمجھتی اس کے بغیر سو نہیں سکتا؟" وہ اپنی اصلیت پر اترنے لگا۔

"نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔" میں نے بات ٹالی اور وہ ہنس پڑا۔

"آپ کو صفیہ سے بہت محبت ہے؟" میں نے رازداری کے انداز میں پوچھا۔

"محبت"، وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اسے گالی دی ہو۔ "مجھے اس سے قطعی محبت نہیں"، اس نے کڑوا منہ بنا کر بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں۔ "میں محبت کا قائل نہیں"۔

"ارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"نہیں"،

"اور آپ کے کبھی گلسوئے بھی نکلے۔ خسرہ بھی نہیں ہوئی۔ مگر کالی کھانسی تو ضرور ہوئی ہوگی"، وہ ہنس پڑا۔

"محبت سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ محبت تو ایک بڑی لمبی چوڑی چیز ہے۔ محبت ماں سے بھی ہوتی ہے۔ بہن اور بیٹی سے بھی..... بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے۔ چپلوں اور بوٹ جوتے سے بھی ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست کو اپنی کتیا سے محبت ہے۔ ہاں مجھے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔" وہ بیٹے کے خیال پر اُچک کر کرسی پر اونچا ہو گیا۔ خدا کی قسم اتنا سا پیروں چلتا تھا۔ بڑا شریر تھا۔ گھٹنوں کے چلتا تھا تو فرش کی درازوں میں سے مٹی نکال کر کھا لیا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا

مانتا تھا" عام باپوں کی طرح منٹو نے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا۔

"آپ یقین کیجئے چھ سات دن کا تھا کہ میں اسے اپنے پاس سلانے لگا۔ میں اسے خود تیل مل کر نہلاتا۔ تین مہینہ کا بھی نہیں تھا ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا تھا۔ بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی۔ رات کو تو بس پڑی سوئی رہتی میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلوا لیتا۔ اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے کو دودھ پلوانے سے پہلے یوڈی کلون یا اسپرٹ سے صاف کر لینا چاہیئے۔ نہیں تو بچے کے منہ میں دانے ہو جاتے ہیں،" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا اور میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی کہ یہ کیسا مرد ہے جو بچے پالنے میں مشاق ہے۔

"مگر وہ مرگیا،" منٹو نے مصنوعی مسرت چہرہ پہ لا کر کہا۔ "اچھا ہوا جی وہ مرگیا۔ مجھے تو اس نے آیا بنا ڈالا تھا اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اس کے پوتڑے دھوتا ہوتا نکما ہو کر رہ جاتا مجھ سے کوئی کام تھوڑی ہوتا۔ سچ عصمت بہن مجھے اس سے عشق تھا۔"

"چلتے چلتے اس نے پھر کہا کہ صفیہ آنے والی ہے۔ بس جی خوش ہو جائے گا۔ آپ کا اس سے مل کر۔"

اور واقعی صفیہ سے مل کر میرا جی خوش ہو گیا۔ منٹوں میں ہماری اتنی گھٹ گئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہونے لگیں۔ جو صرف عورتیں ہی کہتی ہیں، عورتیں ہی سنتی ہیں جو مردوں کے کانوں کے لیے نہیں ہوتیں۔

مجھے اور صفیہ کو یوں سر جوڑے کھسر پھسر کرتے دیکھ کر منٹو جل گیا اور طعنے

دینے لگا۔ اس نے پچھلے کمرے کی چوبی دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری سرگوشیاں سن لی تھیں۔ وہ شریر بچوں کی طرح بولا۔

"توبہ توبہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ عورتیں بھی اتنی گندی باتیں کرتی ہیں"!

صفیہ کے شرم سے کان لال ہو گئے۔

"اور آپ سے تو عصمت بہن مجھے قطعی امید نہ تھی کہ یوں محلے کی جاہل عورتوں کی طرح باتیں کریں گی۔ کب شادی ہوئی، شادی کی رات کیسی گزری۔ بچہ کب اور کیسے پیدا ہوا۔ توبہ ہے" وہ بڑبڑانے لگا۔

میں نے فوراً لگام لگائی "حد ہے منٹو صاحب میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ سمجھتی تھی۔ اور آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں۔ ان میں گندگی کیا ہے بچہ کی پیدائش دنیا کا حسین ترین حادثہ ہے اور یہ کھانا پکانا ہی تو ہمارا ٹریننگ اسکول ہے۔ کیا سمجھتے ہیں۔ آپ کیا کالج میں مجھے بچے دینا سکھایا گیا ہے۔ وہاں کے بوڑھے پروفیسر بھی آپ کی طرح ناک بھوں چڑھا کر توبہ توبہ کہتے رہے۔ محلے عورتوں ہی سے تو ہم نے زندگی کے اہم ترین راز جانے ہیں۔

"یہ صفیہ سخت جاہل ہے ادب و دب کچھ نہیں سمجھتی ہر بات پر تھو تھو کرتی آپ کی تحریروں سے سخت خفا ہے۔ آپ کا جی نہیں گھبراتا اس سے گھنٹوں باتیں کرتے کہ قورمے میں کتنی ہلدی ، اردکی دال کے دہی بڑے۔ اسے منٹو صاحب قورمے میں ہلدی کہاں پڑتی ہے۔

اور منٹو لڑ پڑا۔ وہ بضد تھا کہ ہلدی ہر کھانے میں پڑنی چاہیئے اور جو نہیں پڑتی تو سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ "میرا ایک راجپوت دوست تھا۔ وہ گھی اور ہلدی

پی کر جاڑوں میں کسرت کیا کرتا تھا۔ پورا پہلوان تھا" اور ہم معترف تھے کہ آپ کا دست گھی اور ہلدی چھوڑ کر کیچڑ پیتا تھا۔ ہم کسی شرط پر ہلدی ڈالنے کو تیار نہیں اور منٹو کو قائل ہونا پڑا۔

میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادہ سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ذہنی قوتوں پہ دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے۔ دماغ میں جھاڑو سی دی جا رہی ہے اور بعض وقت بحثیں اتنی طویل اور گھن دار ہو جاتیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے سوت کی پونیاں الجھ گئی ہیں۔ اور واقعی سوچنے اور سمجھنے کی قوت پر جھاڑو پھر گئی۔ مگر دونوں بحثے جاتے۔ الجھے جاتے۔ بدمزگی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا ملکہ تھا۔ مگر منٹو بالکل رو بانسا ہو جاتا۔ آنکھیں موٹے پلکوں کی طرح تن کر پھیل جاتیں۔ نتھنے پھڑکنے لگتے منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا اور وہ جھنجھلا کر اپنی حمایت میں شاہد کو پکارتا اور جنگ ادب یا فلسفہ سے پلٹ کر گھریلو صورت اختیار کر لی۔ منٹو جھنجھلا کر چلا جاتا۔ شاہد مجھ سے لڑتے کہ تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو۔ منٹو آج خفا ہو کر گیا ہے۔ اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری ہمت ہے کہ اس کے ہاں جاؤں وہ بدتمیز آدمی ہے۔ کچھ کہہ بیٹھے گا تو میری اس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی۔"

اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منٹو کو کڑوی بات کہہ دی ممکن ہے روٹھ جائے اور ہماری اور صفیہ کی دوستی بھی ختم ہو جائے جو اب منٹو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔ منٹو کی خود داری رعونت کی حدوں کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ

اپنے دوستوں پر رعب جمانے کا بڑا شوقین تھا اور اگر ان دوستوں کے سامنے جنکو وہ مرعوب کر چکا ہو کوئی اس کا مذاق بنا دے تو وہ بُری طرح چڑ جایا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ویسے وہ اور میں تو پیتے کے ہیں۔ ایک دوسرے کو کہہ سن سکتے ہیں۔ مگر عام لوگوں کے سامنے ایک دوسرے پہ چوٹیں نہ کرنی چاہییں وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کی ذہنی سطح کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا۔

لیکن صبح لڑائی ہوتی اور اتفاق سے شام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اسی قدر جوش سے ملتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور ویسے ہی گھل مل کر باتیں ہوتیں۔ تھوڑی دیر ہم ایک دوسرے سے بڑے ادب اور ضرورت سے زیادہ نرمی سے بو ہر بات پہ ہاں میں ہاں ملاتے۔ مگر میرا جلد ہی اس تصنع سے دل اکتا جاتا اور کا بھی اور پھر چلنے لگتی۔ دونوں طرف سے آتش بازی اور گولیوں کی سی تندی آ جاتی۔ لوگ ہم دونوں کو یوں الجھا کر مزہ لینے لگتے اور ہم پھر جل کر ایک دوسرے سے جاتے۔ ہم بحث کرتے تھے۔ اپنی دلچسپی کے لیے نہ کہ ان کے لیے منسٹر بن بن لطف پیدا کرتے۔ منٹو کی بھی یہی رائے تھی کہ گھر پہ چاہے جتنی الٹی سیدھی کرلیں۔ مگر محفلوں میں ہمیں مورچہ بنا کر جانا چاہیئے اور ہمارا مورچہ اتنا مضبوط ہوگا لوگوں کے چھکے چھڑا دے گا۔ مگر مجھے عموماً مورچے سے اپنی وفاداری کا نہ رہتا اور مورچہ بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنکارنے لگتا۔

یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ یا زبان میں لکنت نہ پائی مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پیے ہو تو یہ یقین دلانے کی کوشش

کہ وہ بالکل نشہ میں نہیں اور جان کر آجاتا تھا۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ عصمت بہن میں بالکل نشہ میں نہیں اور میں آج پینا چھوڑ سکتا ہوں۔ میں جب چاہوں پینا چھوڑ دوں آپ شرط لگا بیٹے"

"میں شرط نہیں لگاؤں گی کیوں کہ آپ ہار جائیں گے۔ آپ پینا نہیں چھوڑ سکتے۔ ..... اور آپ نشہ میں ہیں"

کیسا کیسا منٹو ثبوت دیتا کہ وہ نشے میں نہیں وہ اسی وقت پینا چھوڑ سکتا ہے صرف شرط لگانے کی دیر ہے۔ ایک دن تنگ آکر مجھے شرط لگانی پڑی اور منٹو شرط ہار گیا۔ میں جیت گئی۔ مگر کیا؟ شرط تو لگی تھی لیکن کوئی رقم مقرر نہ ہوئی تھی اس کے بعد جب منٹو کو بہت چڑھتی اور وہ شرط لگانے پر اڑ جاتا اور سوائے شرط لگانے کے گلو خلاصی نظر نہ آتی تو ہار کر مجھے شرط لگانا ہی پڑتی۔

منٹو کو خودستائی کی عادت تھی۔ مگر عموماً میرے سامنے اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا کرتا تھا۔ اور اس وقت میرے اور اپنے سوا دنیا میں کسی کو ادیب نہ مانتا خاص طور پر کرشن چندر اور دیوندر ستیارتھی کے خلاف ہو جاتا۔ اگر ان کی تعریف کرو تو سلگ اٹھتا۔ میں کہتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مانی جائے اور وہ تنقید نگاروں کو جلی کٹی سنانے لگتا۔ ایک سرے سے ان کے وجود کو ہی سم قاتل سمجھتا خاص طور پر ادب کے لیے۔

"بکواس کرتے ہیں یہ لوگ" وہ جل کر کہتا۔ "جو یہ کہتے جائیں۔ بس اس کا الٹا کرتے جاؤ۔ یہی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں۔ چھپ چھپ کر میری کہانیاں پڑھتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھنے کی بجائے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اس لطف کی یاد پر نادم ہو کر فول

لکھتے ہیں۔ وہ کبھی اتنا چڑ جاتا کہ میں اسے تسلی دینے کو کہتی۔ جب آپ کو یقین ہے کہ یہ اول فول لکھتے ہیں تو آپ اُن کا جواب کیوں دینے لگتے ہیں۔ اگر تنقید سے آپ کو مدد نہیں ملتی تو نہ لیجئے۔ مگر رائے عامہ کو تو مطعون نہ کیجئے۔ مگر وہ بھناتا رہتا۔

ایک دن بڑی سنجیدہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے۔

"مقدمہ دائر کریں گے۔"

میں نے کہا "کون"

کہنے لگے۔ "ہم یعنی میں اور آپ۔ اس مردود نے میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعہ میں یہ لکھ کر چھاپی ہے کہ یہ فحش ہے۔ ایسے ادب سے ملک کو بچانا چاہیئے اب اس کمبخت سے پوچھو کہ کیسی الٹی بات کر رہا ہے۔ ایک تو اسے کتاب میں چھاپ کر مشتہر کر رہا ہے۔ دوسرے پیسے کمانے کا الگ انتظام کر رہا ہے اس نے ہماری اجازت کے بغیر کیوں کہانیاں چھاپی ہیں اسے نوٹس دلوا رہا ہوا کہ ہرجانہ دے۔" پھر نہ جانے بھول بھال گئے۔

منٹو اپنی ڈینگوں سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شیخی بگھارا کرتا تھا۔ رفیق غزنوی سے کچھ عجیب قسم کی محبت تھی جو میری سمجھ میں نہ آئی جب ا کا تذکرہ کیا یہی کہا "بڑا بدمعاش لفنگا ہے۔ ایک ایک کر کے چار بہنوں سے شاد کر چکا ہے۔ لاہور کی کوئی رنڈی ایسی نہیں جس کی اس نے اپنے جوتے پر ناک نہ گھس بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے عشقوں کے قصے تفصیلوں سے سنایا کرتا۔ ایک دن مجھے اس سے ملانے کو کہ میں نے کہا کیا کروں گی مل کر، آپ تو کہتے ہیں لفنگا ہے وہ۔"

ن گئے" ارے جب ہی تو ملا رہا ہوں۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لفنگا اور بدمعاش آدمی ہوتا ہے۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے"

میں نے کہا۔ "منٹو صاحب لفنگا، شریف، بدمعاش یہ آخر کیسا آدمی ہے میری میں نہیں آتا۔ آپ مجھے جتنا ذہین اور تجربہ کار سمجھتے ہیں، شاید ویسا نہیں"

"آپ بنتی ہیں" منٹو نے بڑا بن کر کہا۔ "جبھی تو میں آپ کو رفیق سے نا چاہتا ہوں — بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں سکتی"

"میں بھی عورت ہوں" میں نے فکرمند بن کر کہا۔ اور وہ کھسیانہ ہو گیا۔

"میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں"

"مگر آپ کی بہن بھی تو عورت ہو سکتی ہے" منٹو نے قہقہہ لگایا۔

"ہو سکتی ہے! یہ خوب کہا" مگر منٹو کو ضد ہو گئی۔ "آپ کو اس سے ملنا پڑے گا بیٹھے تو سہی"

"میں اُسے اسٹیشن پہ دیکھ چکی ہوں۔ آپ نے میرے، ایسے کان بھر دیئے کہ میں بھاگ آئی کہ کہیں کمبخت پہ عاشق نہ ہونا پڑے"

اور رفیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ جو دنیا کے ساتوں عیب کرنے کے رفیق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو مہذب انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بدمعاش ہو سکتا ہے۔ ساتھ نہایت ایمان دار اور شریف بھی۔ یہ کیسے اور کیوں ؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش ں۔ یہ منٹو کا میدان ہے۔ وہ دنیا کی ٹھکرائی گھورے پہ پھینکی ہوئی غلاظت میں سے

ہوتی چن کر نکال لاتا ہے۔ گھوڑا اگر یہ سونے کا اسے شوق ہے۔ کیونکہ دنیا کے سوا
والوں پر اُسے بھروسہ نہیں۔ ان کی عقل اور فیصلہ پر بھروسہ نہیں۔ وہ ان کی شر
اور پاکباز بیویوں کے دل کے چور پکڑ لیتا ہے اور کوٹھے میں رہنے والی رنڈ
کے دل کے تقدس سے اس کا موازنہ کرتا ہے۔ عطر میں ڈوبی ہوئی عیش پسند
سے میل اور پسینے میں سڑتی ہوئی گھائن زیادہ خوشبودار معلوم ہوتی ہے۔"
میں حالانکہ جسم ہی جسم ہے۔ غور سے دیکھیے تو جسم کے اندر روح بھی ہے۔ عیش
طبقہ کی پھٹے ہوئے دودھ کی طرح پھٹکیوں دار روح اور کچلے ہوئے طبقے کی
سے دور اصلیت۔ اگر طبقاتی تفریق کا سوال نہیں تو ہم اسے قطعی طور پر جسمانی
بھی نہیں کہہ سکتے۔ منٹو کے ذہن میں ضرور دو طبقوں کے فرق کا خیال تھا اور
اس بت کو جس کی دنیا پوجا کرے، زمین پر پٹخنے میں بڑی بہادری محسوس کرتا
وہ ہمیشہ اپنے بدمعاش دوستوں کے کارنامے فخریہ سنایا کرتا۔ ایک دن
نے جلانے کو کہہ دیا یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصل میں نہ ہزاروں رنڈیوں
ان کا تعلق رہا اور نہ ہی انہوں نے کبھی کسی عورت کی آبروریزی کی اور وہ طرح
سے مجھے یقین دلانے لگا کہ وہ لوگ واقعی بدمعاشیاں کرتے ہیں۔ اتنی ہی بلکہ ا
سے بھی زیادہ۔

"وہ سب جھوٹ!" میں دھاندلی کرنے لگی۔"

"ارے آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بازار میں جو چاہے جا سکتا ہے۔"

"مگر ان لوگوں کی اتنی ہمت نہیں جو طوائفوں کے کوٹھوں پہ جا سکیں۔ بہت
ہوں گے۔ گانا سن کر چلے آتے ہوں گے۔"

"مگر میں خود گیا ہوں، رنڈی کے کوٹھے پر۔"

"گانا سننے" میں نے چڑایا۔

"جی نہیں" اپنے دام وصول کرنے اور ہمیشہ میرے دام وصول ہو گئے۔"

بھی میں نے کہا۔

"میں نہیں یقین کرتی۔"

"وہ کیوں؟" وہ اٹھ کر بالکل میرے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"بس میری مرضی۔ آپ میرے اوپر رعب ڈالنا چاہتے ہیں۔"

"بھئی خدا کی قسم میں کہتا ہوں میں گیا ہوں۔"

"خدا پر آپ کو یقین نہیں بیکار اسے نہ گھسیٹئے۔"

"اپنے مرحوم بچے کی قسم کھاتا ہوں۔ میں ایک بار نہیں بلکہ۔۔۔۔۔۔۔"

"مرحوم بچے کو اب آپ جھوٹی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

اور منٹو وہیں بھسکڑا مار کر بیٹھ گیا کہ آج تو منوا کر رہوں گا کہ میں رنڈی باز ہوں۔

کی گواہی دلوائی۔

میں نے دو منٹ میں صفیہ کو چیت کر دیا کہ ممکن ہے یہ تم سے کہہ کر گئے ہوں

ڈی کے یہاں جا رہے ہیں اور اگر گئے بھی ہوں تو سلام کر کے چلے آئے

گئے۔

صفیہ چپ سی ہو گئی۔ "اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام کر کے آگئے یا۔۔۔"

ب گومگو میں رہ گئی۔

منٹو نے جوش میں کچھ زیادہ تیزی سے پی ڈالی اور بری طرح لڑنے لگا۔

یہ تو آج منوا کر چھوڑوں گا کہ میں پکا رنڈی باز ہوں اور میں نے کہہ دیا آج ادھر دنیا ادھر ہو جائے۔ میں ان کے دوں گی نہیں۔

ایک تو نشہ دوسرے منٹو کے مزاج کی جلی تلی اگر بس چلتا تو میرا منہ نوچ لیتا صفیہ نے بسور کر کہا۔ بہن مان جاؤ۔ شاہد نے کہا بس اب گھر چلو۔ مگر نے شاہد کی ٹانگ لینی شروع کی اور کہہ دیا کہ بغیر قائل ہوئے جانے نہیں د خاصا ہنگامہ ہو گیا۔

بڑی سنجیدگی سے منٹو نے شاہد سے کہا چلو رنڈی کے یہاں ابھی اسی آج میں قائل نہ کر دوں تو میں نے ماں کا دودھ نہیں سور کا دودھ پیا۔" مگر میر اور چڑایا۔

"آپ جائیں وائیں گے نہیں یونہی بائکلا برج پر گھوم کر آجائیں گے اور ہم نہیں کریں گے کیا فائدہ؟"

اب تو منٹو کے سر میں لگی تو ایڑی میں جا کر شاید ہی بجھی ہو۔ غصہ ضبط کر کے پھر کیسے یقین دلایا جائے۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں یعنی مجھے اور صفیہ کو بھی ساتھ لے چلیے۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" صفیہ بگڑی۔ "تمہارا تو دماغ خراب ہوا ہے جاؤ۔"

جائے گی کیسے نہیں۔" منٹو غرایا۔

"چلو چلو"..... صفیہ کو ہم نے آنکھ ماری اور چاروں چلے درواز سے ہم دونوں تو نکل آئے۔ منٹو کو صفیہ نے نہ جانے کیسے قابو میں کیا۔

دفعہ جب ملاقات ہوئی تو منٹو نے خوب قہقہے لگائے اور چپکے سے کہا "مگر اب تو مان جاؤ"۔

میں نے کہا، "قطعی نہیں"۔

مجھے نہیں معلوم منٹو کو تجربہ تھا یا جو کچھ اس نے رنڈی کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ اس کے اپنے اصول اور یقین کی بنا پر ہے۔ کیونکہ اگر وہ رنڈی کے کوٹھے پر گیا ہوگا تو وہاں رنڈی سے زیادہ اس نے ایک عورت کا دل دیکھا ہوگا جو باوجود موری کا کیڑا ہے۔ مگر زندگی کی قدروں کو پیدا کرتی ہے۔ اچھے اور برے کو ناپنے کے جو پیمانے عام طور پر بنا دیئے گئے ہیں۔ وہ انہیں توڑ پھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی تول سے ان کا اندازہ لگاتا تھا، خوشیا جیسے ڈھیٹ اور نکمے انسان کی رگ حمیت بھی پھڑک سکتی ہے، گوپی ناتھ جیسا رقیق انسان بھی دیوتاؤں پر بازی لے جا سکتا ہے۔ مہان دیوتا بھی سرنگوں ہو سکتے ہیں۔ قومی رضاکار بدکار بھی ہو سکتے ہیں اور لاش سے زنا کرنے والا خود بھی لاش بن سکتا ہے۔

کبھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ ڈور ٹوٹتی معلوم ہوتی۔ ایک دن کسی بات پر ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اتر آیا دانت پیس کر بولا۔

"آپ عورت ہیں۔ ورنہ ایسی بات کہتا کہ دانت کھٹے ہو جاتے"۔

"دل کا ارمان نکال لیجیے، مروت کی ضرورت نہیں"، میں نے چڑایا۔

"اب جانے بھی دیجیے، کوئی مرد ہوتا تو بتاتے"۔

"بتا بھی دیجیے۔ ایسے کون کون سے تیر ترکش میں باقی رہ گئے ہیں۔ لگا بھی دیجیے"۔

"آپ جھینپ جائیں گی"۔

"قسم خدا کی نہیں جھینپوں گی"۔

"تو آپ عورت نہیں"۔

"کیوں کیا عورت کے لیے جھینپنا اشد ضروری ہے۔ چاہے جھینپ آئے یا نہ آئے۔ بڑا افسوس ہے۔ منٹو صاحب آپ بھی عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ اصول بناتے ہیں۔ میں سمجھی تھی آپ 'عام لوگوں' کی سطح سے بلند ہیں"، میں نے مسکہ لگایا۔

"قطعی نہیں ... میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا"۔

"تو پھر کہیئے نہ وہ جھینپا دینے والی بات"۔

"نہیں۔ اب غصہ اُتر گیا"۔ وہ ہنس کر بولا۔

"اچھا دوستی ہی میں سہی بتائیے وہ کون سی خطرناک بات تھی"۔

"کچھ نہیں ..... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شاید کوئی موٹی سی گالی دے دیتا"۔

"بس؟" میں نے ناامید ہو کر کہا۔

"یا شاید کس کے جھانپڑ مارتا"۔ نادم ہو کر بولا۔

"مجھ پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا میں نے ایسی ضخیم ضخیم گالیاں سُنی ہیں کہ حد نہیں اور میرے تھپڑ بھی خاصے زور کے پڑ چکے ہیں۔ مگر پہلی دفعہ آپ نے عورت سمجھ کر رعایت کی۔ میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار"، اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

ایک دن دفتر میں گرمی سے پریشان ہو کر میں نے سوچا جا کر منٹو کے یہاں آرام کر لوں پھر واپس ملا جاؤں۔ دروازہ حسبِ معمول کھلا ہوا تھا۔ جا کر دیکھا تو صفیہ منہ پھلائے لیٹی ہے۔ منٹو ہاتھ میں جھاڑو لیے سٹاسٹ پلنگ کے نیچے ہاتھ مار رہا ہے اور ناک پر کرتے کا دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے" میں نے میز کے نیچے جھانک کر پوچھا۔

"کرکٹ کھیل رہا ہوں" منٹو نے بڑی بڑی مورپنکھ جیسی پتلیاں گھما کر جواب دیا۔

"یہ لیجیے! ہم نے سوچا تھا ذرا آپ کے یہاں آرام کریں گے تو آپ لوگ روٹھے بیٹھے ہیں" میں نے واپس جانے کی دھمکی دی۔

"ارے" صفیہ اٹھ بیٹھی "آؤ آؤ"۔

"کیا ہے کا جھگڑا تھا" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں میں نے کہا کھانا پکانا گرہستی وغیرہ مردوں کا کام تو نہیں۔ بس جیسے تم سے الجھتے ہیں مجھ سے بھی الجھ پڑے کہ کیوں نہیں مردوں کا کام میں ابھی جھاڑو دے سکتا ہوں۔ میں نے بہت روکا تو اور لڑے کہنے لگے ایسا ہی ہے تو طلاق لے لے" صفیہ نے بسور کر کہا۔

منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لیے میں نے بن کر کھانسنا شروع کیا۔ صبح ہی صبح میونسپلٹی کے بھنگی نے صحن صاف کرنے کے بہانے دھول حلق میں جھونکی۔ "اب آپ ارمان نکال لیجیے۔ گرمی کے مارے جان نکل رہی ہے۔"

جلدی سے جھاڑو چھوڑ منٹو ہوٹل سے برف لانے چلا گیا۔ صفیہ ہنڈیا بگھارنے چلی گئی۔ برف لا کر منٹو نے تولیہ دیوار پہ مار مار کر توڑی اور پلیٹ میں بھر کر سامنے رکھ دی اور اکڑوں بیٹھ گیا۔

"اور سنائیے،" اس نے حسب عادت کہا۔ ہانڈی کے بگھار سے مجھے زور سے ابکائی آئی۔

"افوہ یہ صفیہ کیا مردہ جلا رہی ہے؟" میں نے ناک بند کر کے کہا۔ منٹو نے چونک کر مجھے دیکھا سر سے پیر تک۔ بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں اور چھلانگ مار کر جھپٹا۔ باورچی خانے میں صفیہ چیختی رہی اور اس نے بھر لوٹا پانی پتیلی میں جھونک دیا۔

واپس آ کر وہ سہما سہما رسان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کچھ جھینپ کر ہنس دیا۔

میں بیوقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

صفیہ بڑبڑاتی آئی تو اسے زور سے ڈانٹا پھر بڑے شرمیلے انداز سے بولا۔

"آپ کے پیٹ میں بچہ ہے؟" جیسے بچہ میرے نہیں خود اس کے پیٹ میں ہو۔ میں نے فوراً تاڑ لیا۔ جب صفیہ کے پیٹ میں بچہ تھا تو اسے بھی بگھار سے ابکائی آتی تھی۔"

"منٹو صاحب خدا کے لیے دائیوں جیسی باتیں نہ کرو۔" میں نے چڑ کر کہا۔

وہ زور سے ہنسا۔

"ارے واحساس میں کیا برائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں ابھی کیریاں لاتا ہوں۔" وہ لپک کر بیچے گیا اور کرتے کے دامن میں بچوں کی طرح کیریاں بھر کے لے آیا۔ کیریاں چھیل کر بڑی نفاست سے نمک مرچ لگا کر مجھے دیں اور خود اکڑوں بیٹھا مجھے غور سے دیکھ کر مسکراتا رہا۔

"صفیہ ارے صفیہ۔" وہ چلایا۔ صفیہ دھوئیں سے اٹی آنکھیں آنچل سے پونچھتی ہوئی آئی۔ "کیا ہے منٹو صاحب کتنا چلاتے ہو۔"

"ارے بیوقوف۔ ان کا بیر ہارتی ہے۔" اس نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا "اُف گندگی کی انتہا ہے۔ جبھی تو آپ کو لوگ فحش نگار کہتے ہیں۔" میرے اس بگڑنے پر منٹو خوب چہکا، اور بڑی بوڑھیوں جیسے مشورے دینے لگا۔

"پیٹ پر زیتون کے تیل کی مالش سے گھرو۔ نچے نہیں پڑیں گے۔"

نہار منہ سیب کا مربہ کھانے سے ابکائیاں نہیں آتیں۔"

"کھوپرہ کھانے سے بچہ گورا ہوگا اور آسانی سے ہوگا۔"

"جاپے میں برف نہ چباپئے گا۔ نلے سوج جلتے ہیں۔ کیوں صفیہ۔"

"ہٹو منٹو صاحب کیسی باتیں کرتے ہو۔" صفیہ کھسیا کر رہ گئی۔

اور جب سیما پیدا ہوئی تو صفیہ میرے پاس بیٹھی کانپتی رہی۔ مگر بچی کو دیکھ کر منٹو کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا وہ دیر تک مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بتاتا رہا صفیہ کا دل پگھل گیا اور سال کے اندر اندر۔

منٹو کی بڑی بیٹی نکہت پیدا ہوگئی۔ پونا سے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا، میں فوراً آگئی تو منٹو نے مکان بدل لیا تھا۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر نئے مکان پہنچی تو دیکھا

ڈرائنگ روم میں الگنی پر لپڑ تڑے بچوڑے بچوڑے کر پھیلا رہے ہیں۔ نیا مکان بہت چھوٹا اور بغیر ہوا کا تھا۔ ننھو نے اس لیے بدل لیا کہ اس کا فرش گندہ تھا۔ بچی گھٹنوں چلتی تو پھانس لگ جاتی اور مٹی چاٹ جاتی، یہاں نکہت مزے سے فرش پر کھیل سکے گی۔ حالانکہ نکہت چند ہفتوں کی تھی۔

"وہ مجھے بچے سخت ناپسند ہیں۔" ننھو سنجیدگی سے کہتا۔" جان کو چمٹ جاتے ہیں۔ مجھے ان سے اسی لیے ڈر لگتا ہے۔ ہر وقت انہیں کا خیال رہتا ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔" وہ دودھ کی بوتل دھو کر فلسفہ چھانٹتا میری بھتیجی مینو اسے بڑی پیاری تھی۔ گھنٹوں اس کے ساتھ گڑیوں اور ہنڈکلیوں کی باتیں کیا کرتا۔ فرمائش پر کھڑکی سے بانس ڈال کر اس کے لیے املیاں توڑ کر نیچے سے کرتے کے دامن میں سمیٹ لاتا۔ سیا کو باٹ پر بٹھا کر "رشی شی" کرتا۔ اور بچوں کا بہت شاکی تھا کیوں کہ وہ اُن کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب ہم ملاڈ میں رہتے تھے۔ رات کے کوئی ساڑھے بارہ ہونگے کہ دروازے پر دستک ہوئی معلوم ہوا صفیہ سانس پھولی ہوئی سی کھڑی ہیں میں نے پوچھا کیا ہوا۔ بولی" میں نے منع کیا کہ ایسی حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہیئے مگر وہ کہاں سنتے ہیں۔" ننھو مع نندا آپی اور خورشید انور کے آگئے۔

"یہ صفیہ کون ہوتی ہے منع کرنے والی۔" ہاتھ میں بوتل اور گلاس لیے تینوں در آئے۔ شائد نے پارٹی کو لبیک کہا۔ طے ہوا بہت بھوکے ہیں ہوٹل سب بند ہو چکے ہیں۔ ریل کا وقت گزر گیا۔ کچھ مل جائے تو خود پکا کر کھالیں۔ بس آٹا دال دے دو۔ خود باورچی خانے میں جا کر پکالیں گے

صفیہ کو مردوں کا روٹی پکانا قطعی نہ بھایا۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ باورچی خانہ پر چڑھائی کر دی۔ منٹو آٹا گوندھنے لگے۔ نند اجی انگیٹھی پہ ٹوٹ پڑے اور خورشید انور کو آلو چھیلنے کو دے دیئے گئے جو وہ چھیلنے سے زیادہ پکے کھانے پر مصر تھے اور پھر نوتل بھی باورچی خانہ میں آ گئی۔ لوگ پھسکڑا مار کر وہیں بیٹھ گئے اور کچے پکے پراٹھے پکاتے گئے کھاتے گئے۔ منٹو نے آٹا بہت اچھا گوندھا اور بڑے سلیقے سے روٹی پکائی۔ اور پھر جھٹ سے پودینے کی چٹنی پیس ڈالی۔ کھانا کھا کر سو بھی جاتے۔ اگر زبردستی برآمدے تک گھسیٹا جاتا۔

یہ زندگی تھی جو منٹو کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی معقول آمدنی ہو۔ پینا پلانا ہو۔ قہقہے ہوں اور بے فکریاں۔ ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے پر مقدمہ چلا دیا۔ منٹو کی دیرینہ آرزو بر آئی۔ لاہور میں بھی لطف آ گیا۔ خوب دعوتیں اڑائیں اسی بہانے لاہور کی زیارت ہو گئی۔ زری کے جوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے۔ جیسے کنول کے پھول۔ زری کے جوتے بہت نچنے لگے۔

میرے پیر بڑے بھدے ہیں میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت جوتے؛ میں نے کہا۔

اور میرے پیر اتنے زنانے ہیں کہ مجھے ان سے شرم آتی ہے؛ مگر ہم دونوں نے کئی جوڑ جوتے خریدے۔

"آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں"؛ میں نے کہا۔

بکواس ہیں میرے پیر۔ لائیے بدل دیں"

"بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں" میں نے رائے دی۔

"بخدا مجھے کوئی اعتراض نہیں" منٹو نے کہا۔

محبت کے مسئلہ پر کتنی ہی جھڑپیں ہوئیں مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہ یہی کہتا۔

"محبت کیا ہوتی ہے۔ مجھے اپنے زری کے جوتے سے محبت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچوں بیوی سے محبت ہے"

"میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دوشیزہ سے ہو جاتا ہے۔"

"ہاں ..... میں سمجھ گیا۔ منٹو نے دور ماضی کے دھندلکوں میں کچھ ٹٹول کر سوچتے ہوئے خود سے کہا" کشمیر میں ایک چرواہی تھی۔"

"پھر" میں نے داستان سننے والوں کی طرح ہنکارہ دیا۔

"پھر کچھ نہیں" وہ ایک دم بچاؤ کے لیے تن گیا۔

"آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں اور آج آپ شرما رہے ہیں"

"کون گدھا شرما رہا ہے" منٹو نے واقعی شرما کر کہا۔۔۔ بڑی مشکل سے اس نے بتایا۔

"بس جب وہ مویشی ہانکنے کے لیے اپنی لکڑی اوپر اٹھاتی تھی۔ تو اس کی سفید کہنی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں کچھ بیمار تھا۔ روز ایک کمبل لے کر پہاڑی پہ جا کر لیٹ جایا کرتا تھا اور سانس روک کے اس لمحے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو آستین سرک جائے اور مجھے اس کی سفید کہنی دکھائی دے جائے۔

"کہنی" میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں..... میں نے سوائے کہنی کے اس کے جسم کا اور کوئی حصہ نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی۔ اس کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کہنی کی جھلک دیکھنے کے لیے لپکتی تھیں۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر ایک دن میں کمبل پر لیٹا تھا۔ وہ مجھ سے تھوڑی دور آکر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ مجھے دکھاؤ۔ تو شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا اور بولی کچھ بھی نہیں، بس مجھے ضد ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔ وہ رُوہانسی ہو گئی۔ مگر میں بھی ضد پہ اڑ گیا۔ اور آخر کو بڑی ردوکد کے بعد اس نے مٹھی کھول کر ہتھیلی میرے سامنے کر دی، اور خود شرم سے گھٹنوں میں منہ دے لیا۔

"کیا تھا اس کی ہتھیلی پر"۔ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"مصری کی ڈلی! اس کی گلابی ہتھیلی پر برف کے ٹکڑے کی طرح پڑی جھلملا رہی تھی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"میں دیکھتا رہ گیا۔" وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

"پھر؟"

"پھر وہ اٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دور سے پلٹ آئی اور مصری کی ڈلی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ مصری کی ڈلی بہت دنوں تک میری قمیض کی جیب میں پڑی رہی۔ پھر میں نے اسے دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن

بعد چیونٹیاں کھا گئیں"۔

"اور لڑکی"۔

"کون سی لڑکی؟" وہ چونکا۔

"وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی تھما دی"۔

"اسے میں نے پھر نہیں دیکھا"۔

"کس قدر پھُس پھسا ہے۔ آپ کا عشق!" میں نے نا امیدی سے چڑ کر کہا۔ مجھے تو، بڑے کسی شعلہ بداماں قسم کے عشق کی امید تھی۔

"قطعی پھُس پھسا نہیں"۔ منٹو لڑ پڑا۔

"بالکل ردّی...... تھرڈ ریٹ۔ مرگھلا عشق۔ مصری کی ڈلی لے کر چلے گئے بڑا تیر مارا"۔

"تو اور کیا کرتا۔ اس کے ساتھ سو جاتا۔ ایک حرامی پلا اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ڈینگیں مارتا"۔ وہ بگڑا۔

"ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ مصری کی ڈلی کڑکڑا کر کھانے کی نہیں۔ دھیرے دھیرے چوسنے کی چیز ہے"۔

یہ وہی منٹو تھا۔ فحش نگار۔ گندہ ذہن

جس نے "بو" لکھی تھی۔

جس نے "ٹھنڈا گوشت" لکھا تھا۔

لیکن مرزا غالب میں چودھویں بیگم مرزا غالب کی محبوبہ ہو یا نہ ہو۔ اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر منٹو کے خیالوں کی لڑکی ضرور ہے۔ جسے وہ ہاتھ نہیں لگانا چاہتا

جس کی کلائی کی جھلک دیکھنے کے لیے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ تضاد جو منٹو کی مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ "نیا قانون" لکھتا ہے اور دوسری طرف "بو" ..... دونوں بھی وہ خود کو غرق کر کے لکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک فحش نگار یاد رہ جاتا ہے اور واقعہ نگار کو وہ بھول جاتے ہیں۔ قصداً یا سہواً؟ ..... ایک ہی بات ہے!

ملک میں فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے کے بعد اس کوٹھی کے وہاں اس کوٹھی میں کیے جانے لگے۔ منٹو اس وقت فلمستان میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مدح سرائی جو اس کی زندگی کا سہارا تھی اُسے ملتی تھی کہ اس کی فلم "آٹھ دن" ناکامیاب نہ ہوئی۔ نہ جانے کیوں وہ فلمستان چھوڑ کر اشوک کمار کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا۔ اُسے اشوک کمار بہت پسند تھا۔ مکرجی نے نہ جانے اسے کیا کہہ دیا تھا وہ ایک دم اُس کے خلاف ہو گیا۔

"بکواس ہے مکرجی۔ فراڈ ہے بنگالی!" وہ تلخی سے کہتا۔

بمبئی ٹاکیز میں جا کر اس نے مجھے بھی کمپنی میں ایک سال کے لیے سینریو ڈیپارٹمنٹ میں کام دلوا دیا اور بہت ہی خوش ہوا۔ "اب ہم دونوں مل کر کہانی لکھیں تو تہلکہ مچ جائے گا۔ میری اور آپ کی کہانی اشوک کمار ہیرو۔ بس پھر دیکھیے گا"

ایک کہانی منٹو کی زیر غور تھی۔ اشوک کو وہ پسند تھی۔ اس سے پہلے اسے مجوزہ کہانی پسند تھی۔ پھر دل سے اتر گئی اور منٹو کی کہانی پسند آئی میرے آنے کے بعد میری کہانی ضد ہی پسند آ گئی خیر منٹو کو ناگوار نہ گزرا اب اشوک کمار نے مجھ منٹو کی کہانی پر کام کرنے کو کہا اور منٹو کو میری کہانی پہ! نتیجہ یہ کہ منٹو مجھ سے [illegible]

منٹو سے شناکی ہونے لگے۔ ادھر کان آمرد "محل" کی کہانی لے کر آ گئے اور اشوک کمار کو وہ پسند آ گئی اور ہم دونوں کی کہانی کھٹائی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال ہوتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار و قطار ہی میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ چین سے بیٹھو۔ تنخواہ ملتی رہے گی۔ کیونکہ کنٹریکٹ ہو چکا ہے۔ لیکن کہانی ہماری نہیں بنے گی۔ لہٰذا میری اور شاہد کی پوری کوششیں اپنی کہانی ضدی کو بنوانے کی طرف لگ گئیں اور بغیر اشوک کمار کے دوسرے درجہ کی تصویروں کی قطار میں ضدی بنائی جانے لگی۔

مگر منٹو کی کہانی رہ گئی! منٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی ادھیڑبن کیا کرتا کبھی انجام کو آغاز بنا کر لکھتا کبھی آغاز کو انجام بنا کر کبھی وسط سے شروع کر کے آغاز پہ ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کہانی کی کوئی کل اشوک کمار کو پسند نہ آئی۔ مگر منٹو یہی کہتا۔

"آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں، میں سمجھتا ہوں، وہ میری کہانی میں ضرور کام کریگا!"

"آپ کی کہانی میں اس کا رول رومنٹک نہیں باپ کا ہے۔ وہ کبھی نہیں کرے گا!" اور منٹو سے پھر لڑائی ہونے لگتی ہے۔ مگر دبی زبان سے یہاں اپنی فکر پڑی تھی اور وہی ہوا کہ "ضدی" اور "محل" بن گئیں۔ منٹو کی کہانی رہ گئی۔ منٹو کو اس کی امید نہ تھی اور اُسے بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا۔ بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا۔ ادھر ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے بیوی بچے اسے پاکستان بلانے لگے۔ منٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا۔ پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوٹھیاں ملیں گی۔ وہاں ہم ہی ہم ہوں گے۔

بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر منٹو مجھ سے واقعی بد دل ہو گیا۔ اتنی لڑائیاں اور جھگڑے میرے اس سے ہوئے مگر کبھی کسی سنجیدہ اصول پر بحث نہیں ہوئی اور اس وقت مجھے معلوم ہوا منٹو کتنا بزدل ہے۔ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لیے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی۔

اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کئے اور سطے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی جھنک محسوس ہوئی۔

پھر جب اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے کشادہ اور خوبصورت قیمتی سامان سے آراستہ۔ ہمیں اس نے پھر خوب بلایا تھا۔ ضدیں ختم ہو گئی تھیں اور ہم نے آرزو شروع کر دی تھی۔ برے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ اس کے پھر دو خط آئے اس نے بلایا تھا۔ ایک سینما الاٹمنٹ کروانے کی امید دلائی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس کی محبت کا پہلے بھی یقین تھا مگر اب تو اور بھی مان جانا پڑا۔ مگر میں نے اس کے خط پھاڑ دیئے اس بات سے چڑ کر وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا۔ میں نے تو اُسے جانے سے نہیں روکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے۔

پھر سُنا منٹو بہت خوش ہے۔

مکان چھن گیا۔ مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔

اور سال گزرتے گئے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی. منٹو کا ایک خط آیا، "کوشش کرکے مجھے ہندوستان بلوالو۔"

پھر معلوم ہوا۔ منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے. کسی نے احتجاج بھی نہ کیا. بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ اچھا ہوا جیل ہو گئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جلسے ہوئے نہ میٹنگیں ہوئیں نہ ریزولیوشن پاس ہوئے۔

پھر معلوم ہوا کہ دماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں یار دوست پہنچا آئے ہیں. مگر ایک دن منٹو کا خط آیا۔ بالکل ہوش و حواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر کراچی سے کہہ کر بمبئی بلوالو تو بہت اچھا ہو۔ اس کے بعد عرصہ تک کوئی خبر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا. پھر سُنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے۔ اب منٹو کی خبروں سے ڈر سا لگتا تھا۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو۔ مگر پاگل خانے سے آگے جو قدم پڑتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑوی خبریں سُنیں کہ جی اُوب گیا۔ بے طرح پینے لگے ہیں، اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھواتے ہیں. پیشگی پیسہ دو تو سب کھا جاتے ہیں۔

منٹو کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اوپر لکھنے کو کہا تھا اور بے ساختہ میری منحوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی۔

"اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ منٹو ہی نہیں عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا۔ آج صرف ایک کسک زندہ ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مر چکا اور میں زندہ ہوں؟ میرے سینے پر یہ زخم جیسا بوجھ کیوں ہے؟ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں، اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا یہی نا کہ اس نے مجھے بہن کہا تھا۔ مگر بہنیں تو کتنی بھائیوں کو دم توڑتا دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ہیں جو نہ دکھتا ہے نہ رستا ہے۔ خاموش سلگتا رہتا ہے۔

آج مجھے صفیہ بے طرح یاد آرہی ہے۔ جی چاہتا ہے۔ ایک بار سر جوڑ کر ہم ویسے ہی باتیں کر سکیں جیسے برسوں ہوئے اڈلفی چیمبر میں کیا کرتے تھے۔ مگر وہ تھیں سہاگ رات اور ہیلو تھی کے نیچے کی باتیں، یہ ہیں موت کی باتیں اسی لیے ڈرتی ہوں اور میرا قلم خشک ہو جاتا ہے۔ نہ جانے ان چند سالوں میں اس پر کیا گزری ہے۔ کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے منٹو کو فراموش کر دیا تب بھی تمہاری محبت اس طوفانی ہستی کا سہارا چٹان بن کر دیتی رہی یا تمہارا پیار تھک کر نڈھال ہو چکا تھا کیا یہ بارہ تیرہ برس کا بھونچال تمہیں جھنجھوڑ کر پست کر گیا یا تم اب بھی اپنے منٹو صاحب کی صفیہ رہیں۔ یا پاس پڑوس کے مہذب لوگ اور رشتہ دار جب اس کی بدردی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں۔ ان خاموش کسوں کا تمہارے پاس کیا جواب تھا جو بے مروتی اور لاپروائی سے تمہارے ارد گرد منڈلایا کرتی تھی۔ دم توڑ گھٹ جاتا تھا۔ کیا اس نے تمہاری پیار بھری گود میں دم توڑا یا وہ تنہا

اور بھرے خاندان میں اکیلا ہی سدھارا۔ کیا بچیاں اپنے باپ کو پاگل مفلس شرابی سمجھتی تھیں۔ اس نے تمہیں تنگدستی اور ندامت کے سوا کیا کچھ بھی نہیں دیا۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم نہ جانے کیوں اس کی تحریروں میں اپنی زندگی کا دھندلا سا بھی عکس نہیں ہے۔ وہ اپنی مشکلوں کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا رہا۔ اس نے انہیں عیب کی طرح چھپایا۔ اسے غرّہ تھا کہ چاہے تو وہ دم بھر میں لاکھوں کما کر پھینک دے۔ جبھی تو اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ فاقے بھی کر سکتا ہے اور اور اس کا قلم بیکسی سے گھسیٹا رہتا ہے۔

تم عاجز تو نہیں آگئیں ادیبوں سے ایونہی خود گھسٹتے ہیں اور اپنوں کو دلدل میں گھسیٹتے ہیں! ......

اور پھر ایک دن اکیلا چھوڑ کر چل دیتے ہیں تو یہ ادیبوں ہی کی عادت نہیں۔ ہمارے دیش کے لاکھوں کروڑوں انسان اسی طرح زندگی میں ناکامی اور نامرادی کا شکار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ادیب ہوں یا کلرک! ان کی یہی زندگی ہے اور کم وبیش یہی انجام جو زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے سسکتے رہتے ہیں۔

نہ جانے دل کیوں کہتا ہے کہ منٹو کی اس جواں مرگی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دامن پر بھی خون کے نظر نہ آنے والے چھینٹے ہیں! جو صرف میرا دل دیکھ سکتا ہے وہ دنیا جس نے اسے ۔ ۔ ۔ نے دیا میری ہی دنیا ہے۔ آج اسے مرنے دیا اور کل یونہی مجھے مرجانے کی اجازت ہوگی اور پھر لوگ ماتم کریں گے۔ میرے بچوں کا بوجھ ان کے

سینے پہ چٹان بن جائے گا۔ جلسے کریں گے۔ چندے جمع کریں گے اور ان جلسوں میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی نہ آسکے گا۔ وقت گزر جائے گا۔ سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے۔

(نقوش۔ منٹو نمبر)

نھنے بھائی بالکل نھنے نہیں، سب سے قدآور سوائے آپا کے سب سے بڑے ہیں، تقسیم کے بعد سے تو نھنے بھائی پاکستان گئے، جانے سے پہلے ہی کئی سال سے ان سے کسی نہ کسی وجہ سے ملنا نہ ہو سکا۔ وہ آگرہ میں رہتے تھے اور ہم لکھنؤ کے بورڈنگ میں چھٹیوں میں بھی وہ کہیں آج ان سے ملے بیس برس ہونے کو آئے، نہ جانے وہ کتنے بدل گئے ہوں گے۔ مگر مجھے تو وہی نھنے بھائی ہمیشہ یاد رہیں گے جو بہت لاڈ کرتے تھے بہت ستاتے تھے اور کبھی کبھی ٹھکائی بھی کر دیتے تھے۔

مگر ٹھکائی سے زیادہ جو بات جلاتی تھی۔ وہ بیوقوف بنانے کی عادت تھی آئے دن وہ ہم لوگوں کو اُلو بنایا کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے۔ "چمڑہ کھاؤں گی؟"

ہم نے کہا: "نہیں، تھو، ہم تو چمڑہ نہیں کھاتے۔"

"مت کھاؤ" یہ کہہ کر چمڑے کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لیا اور مزے مزے کھانے لگے۔

اب تو ہم بڑے چکرائے۔ ڈرتے ڈرتے ذرا سا چمڑہ لے کر ہم نے زبان لگائی۔ ارے واہ کیا مزیدار چمڑہ تھا کھٹا میٹھا۔

"اور دو ننھے بھائی"

"بس بھئی اب ختم ہو گیا"

"کہاں سے لائے تھے ننھے بھائی"

"ہمارا جوتا پرانا ہو گیا تھا۔ وہی کاٹ ڈالا"

بھئی حد ہے یعنی جوتا اتنا مزیدار ہوتا ہے۔ اپن کو خبر ہی نہیں تھی جھٹ ہم نے اپنا جوتا چکھنے کی کوشش کی۔ اخ تھو! توبہ ...... ملے سڑاند کے ناک اڑ گئی۔

"ارے بے وقوف تمہارے جوتے کا چمڑہ اچھا نہیں ہے، آپا کی جو نئی گرگابی ہے نا اسے کاٹو تو اندر سے میٹھا چمڑہ نکلے گا" ننھے بھائی نے رائے دی۔

اور بس اس دن سے ہم آپا کی نئی گرگابی کی تاک میں لگ گئے مگر آپا کی نئی گرگابی سخت لاڈلی تھی، وہ کبھی مہمان آتے یا آپا محرم کے تازیے دیکھنے حکیموں کی گلی جاتیں۔ تب بڑے اہتمام سے گرگابی نکالی جاتی، ہماری فراک سے چاہے وہ دھلی صفا کیوں نہ ہو اس کا چمکایا جاتا، گلابی موزے چڑھتے ان پر وہ نازنین گرگابی پہنی جاتی، اسے پہن کر آپا یوں پھدک چلتیں جیسے

پیروں میں پر لگ گئے ہوں"۔

"تو بس اس دن سے ہم نے گرگابی کو گلاب جامن سمجھ کے اسے تاڑنا شروع کر دیا۔ دیکھنے میں پانی بھر آتا۔ اف وہ کھٹ مٹھی گرگابی جس پہ نیلے ساٹن کا پھندہ سجا تھا بالکل چاکو لیٹ کے کیک کی طرح ہمارے دل پہ چھریاں چلاتی"۔

"عید کا دن تھا آپا اپنی حسین و مہ جبیں گرگابی پہنے پائینچے پھڑکاتی سوئیاں بانٹ رہی تھیں۔ ہم ان کے پیروں کو ایسے گھور رہے تھے، جیسے بلی نہ مال چوہے کو گھورتی ہے"۔

"ہماری نظر تو شاید چوک جاتی ننھے بھائی کی نظر بھلا کیوں بخشتی انہیں اس گرگابی۔ سے اللہ مارے کا بیر تھا، کیوں کہ انہیں دلایا گیا تھا اور آپا کو گرگابی دلا دی گئی تھی آپا ظہر کی نماز پڑھنے جونہی کھڑی ہوئیں، ننھے بھائی نے اشارہ کیا۔"

"اب موقع ہے آپا نیت توڑ نہیں سکیں گی، بس"۔

"مگر کاٹیں کا ہے سے؟ ہم نے پوچھا۔

"آپا کی صندوقچی میں سلمہ ستارہ کاٹنے کی جو قینچی ہے۔ وہ نکال لاؤ"۔

ہم نے جونہی گرگابی کا بھورا ملائم چمڑہ نکال کر منہ میں رکھا ہمارے سر پر دو سو چیلیں جھپٹ پڑیں۔ پہلے تو آپا نے ہماری خوب کندی کی پھر پوچھا۔

"مردار یہ کیا کر رہی ہے"؟

"کھا رہے ہیں"۔ ہم نے نہایت مسکین صورت بنا کر بتایا۔ یہ کہنا تھا کہ

سارا گھر ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔

"پاگل ہو گئی ہے۔"

"بیوقوف، گندی۔"

"یہ اسے کیا ہو گیا ہے۔"

"ارے جوتا کیوں کھا رہی ہے۔" نیک بخت۔

ہماری ٹکا بوٹی ہو ہی رہی تھی کہ ابا میاں آ گئے۔ مجسٹریٹ تھے فوراً مقدمہ معہ مجرمہ اور مقتول گرگابی کے روتی پیٹتی آپا نے پیش کیا وہ ابا میاں جو بڑے سے بڑے مقدمے چٹکیوں میں فیصل کر دینے تھے، حیران رہ گئے، کبھی ہمیں دیکھتے کبھی مقتول جوتے کو اور پھر گہری سوچ میں پڑ جاتے۔

ادھر ننھے بھائی مارے ہنسی کے قلابازیاں کھا رہے تھے، ابا میاں نے عینک کے اوپر سے ہمیں دیکھا، نہایت غمگین آواز میں بولے۔

"سچ بتاؤ۔ جوتا کھا رہی تھیں۔"

"ہاں۔" ہم نے روتے ہوئے اقبالِ جرم کیا۔

"کیوں۔"

"میٹھا ہوتا ہے۔"

"جوتا میٹھا ہوتا ہے۔"

"ہاں۔" ہم پھر رینکے۔

"یہ کیا بک رہی ہے بیگم؟" انھوں نے فکر مند ہو کر اماں کی طرف دیکھا اماں بسورنے لگیں۔

"یا خدا ایک لڑکی ذات دو سرے جوتے کھانے کا چسکر پڑ گیا تو نامراد کون قبولے گا؟"

"ہم نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ بھئی ممنی چمڑہ بہت میٹھا ہوتا ہے، ننھے بھائی نے ہمیں ایک دن کھلایا تھا۔" مگر کون سنتا تھا:

"جھوٹی ہے گدھی"۔ ننھے بھائی مکر گئے۔

"بھلا میں اسے چمڑہ کیسے کھلا سکتا ہوں، چمڑہ کوئی کیسے کھا سکتا ہے کلمنی ہے۔

"اور بہت دن تک یہ معمہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ خود عقل گم تھی کہ یہ ننھے بھائی کے جوتے کا چمڑہ کیسا تھا جو اتنا لذیذ تھا۔"

اور پھر ایک دن خالہ بی بریلی سے آئیں بقچہ کھول کر انہوں نے پتوں میں لپٹا چمڑہ نکالا سب کو بانٹا سب نے مزے مزے سے کھایا اور ہم کبھی انہیں دیکھتے، کبھی چمڑے کے ٹکڑے کو اور پھر ان تمام جوتوں کو یاد کرتے جو آپا کی گرگابی کھانے کی کوشش میں پڑے تھے تب ہمیں معلوم ہوا جسے ہم چمڑہ سمجھتے تھے۔ وہ آم رس تھا۔ جسے آم کا پاپڑ بھی کہتے تھے، اور کسی ظالم نے آم کے رس کو سونگھا کر لال چمڑے کی شکل کی یہ ناہنجار مٹھائی بنا کر ہمیں جوتے کھوائے۔"

ننھے بھائی ہمیں کتنی بار اسی طرح بے وقوف بناتے مگر ہم کو آخر میں کچھ ایسا قائل کر دیا کرتے کہ ان پر سے اعتبار نہ اٹھتا، مگر ایک واقعے نے تو ہماری بالکل ہی کمر توڑ دی نہ جانے کیوں بیٹھے بٹھائے جو آفت آئی تو پوچھ بیٹھے۔

ننھے بھائی یہ ریشم کیسے بنتا ہے؟

"ارے بدھو یہ بھی نہیں معلوم ریشم کیسے بنتا ہے۔ اس میں مشکل ہی کیا ہے

سادہ سوتی دھاگہ لو اسے دو پلنگوں کے پائے پر ایسا تان دو جیسے پتنگ کا مانجھا تانتے ہیں۔ بس جناب خالی اب ایک یا دو حسب ضرورت انڈے لو۔ زردی الگ کر لو اسے خوب کانٹے سے پھینٹو اچھا نمک مرچ ڈال کر آملیٹ بنا کر ہمیں کھلاؤ سمجھیں۔"

"ہاں آں۔۔۔۔ مگر ریشم؟"

"چہ بے وقوف اب سنو تو آ گئے، بچی سفیدی اسے لے کر تنا پھینٹو کہ پھول کر کپا ہو جائے، بس جناب اب یہ سفیدی بڑی احتیاط سے پلنگ کے پایوں پر تنے ہوئے تاگے پر لگا دو۔ جب سوکھ جائے سنبھال کے اتار کر گولا بنا ؤ اب چاہے اس ریشم سے ساڑیاں بنو، قمیض بناؤ۔"

"ارے باپ رے۔" ہم نے سوچا ریشم بنانا اتنا آسان اور ہم اب تک بدھولی بنے جو اماں سے ریشمی کپڑوں کے لیے فرمائش کرتے رہے ارے ہم خود اتنا ڈھیروں ریشم بنا سکتے ہیں تو ہمیں کیا غرض پڑی ہے جو کسی کی جوتیاں چاٹیں۔"

بس صاحب اسی وقت کہیں سے ایک انڈا مہیا کیا گیا، تازہ تازہ کالی مرغی ڈربہ میں دے کر اٹھی اور ہم نے جھپٹ لیا، فوراً نسخہ پر عمل کیا گیا، یعنی زردی کا املیٹ بنا کر خود کھا لیا، کیونکہ ننھے بھائی نہیں تھے اس وقت اب سوال یہ ہوا کہ تاگہ کہاں سے آئے، ظاہر ہے تاگہ صرف آپا کی سینے کی صندوقچی میں مل سکتا تھا۔ سخت مرکھنی تھیں، آپا مگر ہم نے سوچا نرم نرم ریشم کی لچھیوں سے وہ ضرور رام ہو جائیں گی کیا ہے ہم بھی آج انہیں خوش ہی کیوں نہ کر دیں۔ بہت نالاں رہتی ہیں بدتمیزی سے ہمیں اپنا دشمن سمجھ بیٹھی ہیں۔ آج ہم

انہیں شرمندہ کر کے ہی چھوڑیں گے۔ وہ بھی کیا یاد کریں گی کہ کس قدر فسٹ کلاس بہن اللہ پاک نے انہیں بخشی ہے جس نے سوت کا ریشم بنا دیا۔

"آپا سو رہی تھیں اور ہم دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ ریشم کی ملائم لچھیاں دیکھ کر آپا بھی ریشم کا لچھا ہو جائیں گی، ہمیں کتنا پیار کریں گی۔"

"سخت چپچپا اور بدبو دار تھا، ریشم بنانے کا مصالحہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے آدھا تاگہ تو اُلجھ کر بیکار ہو گیا۔ مگر ہم نے بھی آج تہیہ کر لیا کہ اپنی قابلیت کا سکہ جما کر چین لیں گے، لہٰذا ہم تمام رنگ برنگی سوتی ریشمی ریلیں لے کر دو پلنگوں کے درمیان تان دیں۔ کہ ریشم تو اور چمک دار ہو جائے گا۔ سوت ریشم ہو جائے گا، اب ہم نے انڈے کی پھینٹی ہوئی سفیدی سے گھسّے دینے شروع کیے۔"

"کہ اتنے میں آپا آنکھیں ملتی جمائیاں لیتی آن دھمکیں، تھوڑی دیر تو وہ بھونچکی کھڑی دیکھتی رہیں۔

"یہ۔۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہے تُو مردی!" انہوں نے بدقت آواز حلق سے نکالی

"ریشم بنا رہے ہیں!" ہم نے نہایت غرور سے کہا اور ریشم کی بنائی۔"

اور پھر گھر میں وہی قیامت صغرا آگئی جو عموماً ہماری چھوٹی موٹی حرکتوں پر آ جانے کی عادی ہو چکی تھی، ناشکری آپا نے ہماری سخت پٹائی کی۔

"آپا ریشم بنانے چلی تھیں"

"اپنے کفن کے لیے ریشم بنا رہی تھی چڑیل؟"

لوگوں نے زندگی دوبھر کر دی واقعی ریشم بننے کی بجائے تاگہ برتن مانجھنے

کا جوتا بن گیا۔

ہم نے جب ننھے بھائی سے شکایت کی تو بولے۔

"کچھ کسر رہ گئی، انڈا باسی ہوگا۔"

"نہیں تازہ تھا۔ اسی دن بت کالی مرغی دے کر گئی تھی۔"

"کالی مرغی کا انڈا ــــــ؟ کالی مرغی کے انڈے سے کہیں ریشم بنتا ہے۔"

"تو پھر" ہم نے احمقوں کی طرح پوچھا۔"

"سفید جھک مرغی کا انڈا ہونا چاہیے تھا۔"

"اچھا۔"

"اور کیا ــــــ اور آملیٹ تم خود نگل گئیں، ہمیں کھلانا چاہیے تھا۔"

"تب ریشم بن جاتا۔"

"اور کیا!"

اور ہم سوچنے لگے سفید مرغی کم بخت کڑک ہے انڈوں پر بیٹھی ہے پاس سے گزر دل تو غرانی ہے نہ جانے کب انڈے دینے شروع کرے گی۔ خیر دیکھا جائے گا، ایک دن آپا کو ہمیں مارنے پر پچھتانا پڑے گا۔ جب ہم سارا گھر ریشم کی نرم نرم لچھیوں سے بھر دیں گے تو شرم سے آپا کا سر جھک جائے گا اور وہ کہیں گی "پیاری بہن مجھے معاف کردے تو تو سچ مچ میری ہے۔"

تو بچو اگر تم بھی ریشم بنانا چاہتے ہو تو نسخہ یاد رکھو، انڈا سفید مرغی کا ہو، اگر فی الحال وہ کڑک ہے تو استغفار کرو اور زردی آملیٹ ننھے بھائی کو کھلانا خود ہرگز نہ کھانا ورنہ حالات نہایت بھونڈی صورت اختیار کر لیں گے!

لحاف

جب میں جاڑوں میں لحاف اوڑھتی ہوں، تو پاس کی دیوار پہ اس کی پرچھائیں ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک دم سے میرا دماغ بیتی ہوئی دنیا کے پردوں میں دوڑنے بھاگنے لگتا ہے۔ نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا ہے۔

معاف کیجئے گا، میں آپ کو خود اپنے لحاف کا رومان انگیز ذکر بتانے نہیں جا رہی ہوں۔ نہ لحاف سے کسی قسم کا رومان جوڑا ہی جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں کمبل کم آرام دہ سہی، مگر اس کی پرچھائیں اتنی بھیانک نہیں ہوتیں جتنی — جب لحاف کی پرچھائیں دیوار پر ڈگمگا رہی ہو۔ یہ جب کا ذکر ہے، جب میں چھوٹی سی تھی، اور دن بھر بھائیوں اور ان کے دوستوں کے ساتھ مار کٹائی میں گزار دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ میں کمبخت اتنی لڑاکا کیوں ہوں۔ اس عمر میں جبکہ میری اور بہنیں عاشق جمع کر رہی تھیں۔ میں اپنے پرائے ہر لڑکے اور لڑکی سے جوتم پیزار میں مشغول تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اماں جب آگرہ جانے لگیں، تو ہفتہ بھر کے لئے مجھے اپنی ایک منہ بولی بہن کے پاس چھوڑ گئیں ان کے یہاں اماں خوب جانتی تھیں کہ چوہے کا بچہ بھی نہیں، اور میں کسی سے بھی لڑ بھڑ نہ سکوں گی۔ سزا تو خوب تھی! ہاں تو اماں مجھے بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ وہی بیگم جان جن کا لحاف اب تک میرے ذہن

میں گرم لوہے کے داغ کی طرح محفوظ ہے۔ یہ وہ بیگم جان تھیں، جن کے غریب ماں باپ نے نواب صاحب کو اس لئے داماد بنا لیا کہ وہ پکی عمر کے تھے۔ مگر تھے نہایت نیک۔ کبھی کوئی رنڈی بازاری عورت ان کے یہاں نظر نہ آئی۔ خود حاجی تھے، اور بہتوں کو حج کرا چکے تھے۔

مگر انہیں ایک نہایت عجیب و غریب شوق تھا۔ لوگوں کو کبوتر پالنے کا جنون ہوتا ہے بٹیرے لڑاتے ہیں، مرغ بازی کرتے ہیں۔ اس قسم کے واہیات کھیلوں سے نواب صاحب کو نفرت تھی۔ ان کے یہاں تو بس طالب علم رہتے تھے۔ نوجوان گورے گورے پتلی کمر والے لڑکے جن کا خرچ وہ خود برداشت کرتے تھے۔

مگر بیگم جان سے شادی کر کے تو وہ انہیں کل ساز و سامان کے ساتھ ہی گھر میں رکھ کر بھول گئے۔ اور وہ بیچاری دبلی پتلی نازک سی بیگم تنہائی کے غم میں گھلنے لگی۔

نہ جانے ان کی زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے جب وہ پیدا ہونے غلطی کر چکی تھیں، یا وہاں سے جب وہ ایک نواب کی بیگم بن کر آئیں، اور چھپر کھٹ پر زندگی گزارنے لگیں۔ یا جب سے نواب صاحب کے یہاں لڑکوں کا زور بندھا، ان کے لئے مرغن حلوے اور لذیذ کھانے جانے لگے۔ اور بیگم جان دیوان خانے کی درازوں میں ان کی لچکتی کمروں والے لڑکوں کی چست پنڈلیاں اور معطر باریک شبنم کے کرتے دیکھ دیکھ انگاروں پر لوٹنے لگیں۔

یا جب سے، جب وہ منتوں مرادوں سے ہار گئیں، چلے بندھے اور ٹوٹکے اور راتوں وظیفہ خوانی بھی چت ہو گئی۔ کہیں پتھر میں جونک لگتی ہے؟ نواب صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر بیگم جان کا دل ٹوٹ گیا، اور وہ علم کی طرف متوجہ ہوئیں۔۔
یہاں بھی انہیں کچھ نہ ملا۔ عشقیہ ناول اور جذباتی اشعار پڑھ کر اور بھی پستی چھا گئی۔ رات بھی ہاتھ سے گئی، اور بیگم جان جی جان چھوڑ کر بالکل ہی یاس و حسرت کی پوٹ بن گئیں۔

چولہے میں ڈالا تھا ایسا کپڑا لتا۔ کپڑا پہنا جاتا ہے، کسی پر رعب گانٹھنے کے لئے ۱۰

نہ تو نواب صاحب کو فرصت کہ شبنی کرتوں کو چھوڑ کر ذرا ادھر توجہ کریں، اور نہ وہ انہیں کہیں آنے جانے دیتے۔ جب سے بیگم جان بیاہ کر آئی تھیں، رشتہ دار آکر مہینوں رہتے اور چلے جاتے۔ مگر وہ بیچاری قید کی قید رہتیں۔

ان رشتہ داروں کو دیکھ کر اور بھی ان کا خون جلتا تھا کہ سب کے سب مزے سے مال اڑانے، عمدہ گھی نگلنے، جاڑے کا سازوسامان بنوانے آن مرتے، اور وہ باوجود نئی روئی کے لحاف کے بڑی سردی میں اکڑا کرتیں۔ ہر کروٹ پر لحاف نئی نئی صورتیں بنا کر دیوار پر سایہ ڈالتا۔ مگر کوئی بھی سایہ ایسا نہ تھا، جو انہیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہو۔ مگر کیوں جئے پھر کوئی؟ —— زندگی! بیگم جان کی زندگی جو تھی، جینا بدا تھا نصیبوں میں، وہ پھر جینے لگیں، اور خوب جئیں!

بو لے انہیں نیچے گرتے گرتے سنبھال لیا۔ چٹ پٹ دیکھتے دیکھتے ان کا سوکھا جسم ہونا شروع ہوا۔ گال چمک اٹھے، اور حسن پھوٹ نکلا۔ ایک عجیب و غریب تیل کی مالش سے بیگم جان میں زندگی کی جھلک آئی۔ معاف کیجئے گا، اس تیل کا نسخہ آپ کو بہترین سے بہترین رسالہ میں بھی نہ ملے گا۔

جب میں نے بیگم جان کو دیکھا۔ تو وہ چالیس بیالیس کی ہوں گی۔ اوفوہ۔ کس شان سے وہ مسند پر نیم دراز تھیں۔ اور بو ان کی پیٹھ سے لگی بیٹھی کمر دبا رہی تھی۔ ایک اودے رنگ کا دوشالہ ان کے پیروں پر پڑا تھا۔ اور وہ مہارانی کی طرح شاندار معلوم ہو رہی تھیں۔ مجھے ان کی شکل بے انتہا پسند تھی۔ میرا جی چاہتا تھا، گھنٹوں بالکل پاس سے ان کی صورت دیکھا کروں۔ ان کی رنگت بالکل سفید تھی۔ نام کو سرخی کا ذکر نہیں۔ اور بال سیاہ اور تیل میں ڈوبے رہتے تھے۔ میں نے آج تک ان کی مانگ ہی بگڑی نہ دیکھی۔ کیا مجال جو ایک بال ادھر ادھر ہو جائے۔ ان کی آنکھیں کالی تھیں۔ اور ابرو پر کے زائد بال علیحدہ کر دینے سے کمانیں سی

کبھی رہتی تھیں۔ آنکھیں ذرا تنی ہوئی رہتی تھیں۔ بھاری بھاری پھولے ہوئے پپوٹے، موٹی موٹی پلکیں۔ سب سے زیادہ جو ان کے چہرے پر حیرت انگیز جاذب نظر چیز تھی، وہ اس کے ہونٹ تھے۔ عموماً وہ سرخی سے رنگے رہتے تھے۔ اوپر کے ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں سی تھیں، اور کنپٹیوں پر لمبے لمبے بال۔ کبھی کبھی ان کا چہرہ دیکھتے دیکھتے عجیب سا لگنے لگتا تھا۔ کم عمر لڑکوں جیسا!...

ان کے جسم کی جلد بھی سفید اور چکنی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے کس کر ٹانکے لگا دیئے ہوں۔ عموماً وہ اپنی پنڈلیاں کھجانے کے لئے کھولتیں، تو میں چپکے چپکے ان کی چمک دیکھا کرتی۔ ان کا قد بہت لمبا تھا، اور پھر گوشت ہونے کی وجہ سے وہ بہت ہی لمبی چوڑی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن بہت متناسب اور ڈھلا ہوا جسم تھا۔ بڑے بڑے چکنے اور سفید ہاتھ اور سڈول کمر، تو ربو ان کی پیٹھ کھجایا کرتی تھی۔ یعنی گھنٹوں ان کی پیٹھ کھجاتی۔ پیٹھ کھجوانا بھی زندگی کی ضروریات میں سے تھا بلکہ شاید ضروریات زندگی سے بھی زیادہ۔

ربو کو گھر کا اور کوئی کام نہ تھا، بس وہ سارے وقت ان کے چھپر کھٹ پر چڑھی، کبھی پیر، کبھی سر اور کبھی جسم کے اور دوسرے حصہ کو دبایا کرتی تھی۔ کبھی تو میرا دل بول اٹھتا تھا۔ جب دیکھو ربو کچھ نہ کچھ دبا رہی ہیں، یا مالش کر رہی ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا، تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں اپنا کہتی ہوں، کوئی اتنا چھوئے بھی تو میرا جسم تو سڑ گل کے ختم ہو جائے اور پھر یہ روز روز کی مالش کافی نہیں تھی۔ جس روز بیگم جان نہاتیں۔ یا اللہ بس دو گھنٹہ پہلے سے تیل اور خوشبودار ابٹنوں کی مالش شروع ہو جاتی۔ اور اتنی ہوتی کہ میرا تو تخیل سے ہی دل ٹوٹ جاتا۔ کمرہ کے دروازے بند کر کے انگیٹھیاں سلگتیں، اور چلتا مالش کا دور۔ اور عموماً صرف ربو ہی رہتیں۔ باقی کی نوکرانیاں بڑبڑاتی، دروازہ پر سے ہی ضروریات کی چیزیں دیتی جاتیں۔

بات یہ تھی کہ بیگم جان کو کھجلی کا مرض تھا۔ بیچاری کو ایسی کھجلی ہوتی تھی کہ ہزاروں تیل

اور اُبٹنے ملے جاتے تھے۔ مگر کھجلی تھی کہ قائم۔ ڈاکٹر حکیم کہتے: کچھ بھی نہیں، جسم صاف چٹ پڑا ہے۔ ہاں کوئی جلد کے اندر بیماری ہو تو خیر۔" نہیں بھئی یہ ڈاکٹر تو موئے ہیں پاگل — کوئی آپ کے دشمنوں کو مرض ہے؟ اللہ رکھے خون میں گرمی ہے؟" ربّو مسکرا کر کہتی، اور نہیں مہین نظروں سے بیگم جان کو گھورتی۔ اوہ یہ ربّو —— جتنی یہ بیگم جان گوری، اتنی ہی یہ کالی۔ جتنی یہ بیگم جان سفید تھیں، اتنی ہی یہ سرخ۔ بس جیسے تپایا ہوا لوہا۔ ہلکے ہلکے چیچک کے داغ، گٹھا ہوا ٹھوس جسم، پھرتیلے چھوٹے چھوٹے ہاتھ، کسی ہوئی چھوٹی سی توند۔ بڑے بڑے پھولے ہوئے ہونٹ، جو ہمیشہ نمی میں ڈوبے رہتے۔ اور جسم میں عجیب گھبرانے والی بُو کے شرارے نکلتے رہتے تھے۔ اور یہ ننھے ننھے پھولے ہوئے ہاتھ۔ کس قدر پھرتیلے تھے۔ ابھی کمر پر، تو وہ لیجئے پھسل کر گئے کولھوں پر وہاں سے رپٹے رانوں پر۔ اور پھر دوڑ ٹخنوں کی طرف۔ میں تو جب کبھی بیگم جان کے پاس بیٹھتی۔ یہی دیکھتی کہ اب اس کے ہاتھ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

گرمی جاڑے بیگم جان حیدر آبادی جالی کارگے کے کُرتے پہنتیں۔ گہرے رنگ کے پاجامے اور سفید جھاگ سے کرتے، اور پنکھا بھی چلتا ہو۔ پھر بھی وہ ہلکی دُلائی ضرور جسم پر ڈھکے رہتی تھیں۔ انہیں جاڑا بہت پسند تھا۔ جاڑے میں مجھے ان کے یہاں اچھا معلوم ہوتا۔ وہ ہلتی جلتی بہت کم تھیں۔ قالین پر لیٹی ہیں۔ پیٹھ کھج رہی ہے۔ خشک میوے چبا رہی ہیں، اور بس۔ ربّو سے دوسری ساری نوکرانیاں خار کھاتی تھیں۔ چڑیل بیگم جان کے ساتھ کھاتی، ساتھ اٹھتی بیٹھتی، اور ماشاء اللہ ساتھ ہی سوتی تھی۔ ربّو اور بیگم جان عام جلسوں اور مجموعوں کی دلچسپ گفتگو کا موضوع تھیں۔ جہاں ان دونوں کا ذکر آیا، اور قہقہے اٹھے۔ لوگ نہ جانے کیا کیا چٹکلے غریب پر اڑاتے۔ مگر وہ دنیا میں کسی سے ملتی ہی نہ تھیں۔ وہاں تو بس وہ تھیں اور ان کی کھجلی۔

میں نے کہا کہ اس وقت میں کافی چھوٹی تھی، اور بیگم جان پر فدا۔ وہ بھی مجھے بہت

ہی پیار کرتی تھیں۔ اتفاق سے اماں آگرے گئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اکیلے گھر میں بھائیوں سے مار کٹائی ہو گی۔ ماری ماری پھروں گی۔ اس لئے وہ ہفتہ بھر کے لئے بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ میں بھی خوش اور بیگم جان بھی خوش۔ آخر کو اماں کی بھابی بنی ہوئی تھیں۔

سوال یہ اٹھا کہ میں سوؤں کہاں؟ قدرتی طور پر بیگم جان کے کمرے میں۔ لہٰذا میرے لئے بھی ان کے چھپر کھٹ سے لگا کر چھوٹی سی پلنگڑی ڈال دی گئی۔ دس گیارہ بجے تک تو باتیں کرتے رہے ہیں، اور بیگم جان چانس کھیلتے رہے، اور پھر میں سونے کے لئے اپنے پلنگ پر چلی گئی، اور جب میں سوئی، تو رُبّو ویسی ہی بیٹھی ان کی پیٹھ کھجا رہی تھی۔ "بھنگن کہیں کی" میں نے سوچا۔ رات کو میری ایکدم سے آنکھ کھلی، تو مجھے عجیب طرح کا ڈر لگنے لگا۔ کمرہ میں گھپ اندھیرا۔ اور اس اندھیرے میں بیگم جان کا لحاف ایسے ہل رہا تھا، جیسے اس میں ہاتھی بند ہو۔ بیگم جان ـــــ میں نے ڈری ہوئی آواز نکالی، ہاتھی ہلنا بند ہو گیا۔ لحاف نیچے دب گیا۔

"کیا ہے ـــــ سو رہو ـــــ" بیگم جان نے کہیں سے آواز دی۔

ڈر لگ رہا ہے ـــــ میں نے چوہے کیسی آواز سے کہا۔

"سو جاؤ ـــــ ڈر کی کیا بات ہے ـــــ آیت الکرسی پڑھ لو"

"اچھا ـــــ" میں نے جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھی، مگر یَعْلَمُ مَا بَیْنَ ـــــ پر ہر دفعہ آکر اٹک گئی۔ حالانکہ مجھے اس وقت پوری آیت یاد ہے۔

"تمہارے پاس آ جاؤں بیگم جان ـــــ"

نہیں ـــــ بیٹی ـــــ سو رہو ـــــ" ذرا سختی سے کہا۔

اور پھر دو آدمیوں کے کھسر پھسر کرنے کی آواز سنائی دینے لگی ـــــ ہائے رے۔

دوسرا کون؟ میں اور بھی ڈری۔

"بیگم جان ـــــ چور ووُر تو نہیں

"سو جاؤ بیٹا ـــــ کیسا چور" رُبّو کی آواز آئی۔ میں جلدی سے لحاف میں منہ ڈال کر سو گئی۔

صبح میرے ذہن میں رات کے خوفناک نظارے کا خیال بھی نہ رہا۔ میں ہمیشہ کی وہمی ہوں رات کو ڈرنا۔ اٹھ اٹھ کر بھاگنا اور بڑبڑانا تو بچپن میں روز ہی ہوتا تھا۔ سب لوگ کہتے تھے کہ مجھ پر بھوتوں کا سایہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا مجھے خیال بھی نہ رہا۔ صبح کو لحاف بالکل معصوم نظر آ رہا تھا۔

مگر دوسری رات میری آنکھ کھلی، تو ربو اور بیگم جان میں کچھ جھگڑا بڑی خاموشی سے چھپر کھٹ پر ہی طے ہو رہا تھا۔ اور میری خاک سمجھ میں نہ آیا تھا۔ اور کیا فیصلہ ہوا۔ ربو ہچکیاں لے کر روئی پھر بلی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں ——— اونہہ میں تو گھبرا کر سو گئی۔

آج ربو اپنے بیٹے سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہ بڑا جھگڑالو تھا۔ بہت کچھ بیگم جان نے کیا۔ اسے دکان کرائی ——— گاؤں میں لگایا۔ مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ نواب صاحب کے یہاں کچھ دن رہا۔ خوب جوڑے باگے بھی بنے، نہ جانے کیوں ایسا بھاگا کہ ربو سے ملنے بھی نہ آتا۔ ——— لہٰذا ربو ہی اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں اس سے ملنے گئی تھی۔ بیگم جان نہ جانے دیتی مگر ربو بھی مجبور ہو گئی۔

سارا دن بیگم جان پریشان رہیں۔ ان کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا رہا۔ کسی کا چھونا بھی انہیں نہ بھاتا تھا۔ انہوں نے کھانا بھی نہ کھایا۔ اور سارا دن اداس پڑی رہیں۔

"میں کھجا دوں بیگم جان ———" میں نے بڑے شوق سے تاش کے پتے بانٹتے ہوئے کہا۔ بیگم جان مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔

"میں کھجا دوں ——— سچ کہتی ہوں ———" میں نے تاش رکھ دیئے۔

میں تھوڑی دیر کھجاتی رہی، اور بیگم جان چپکی لیٹی رہیں۔ دوسرے دن ربو کو آنا تھا۔ مگر وہ آج بھی غائب تھی۔ بیگم جان کا مزاج چڑچڑا ہوتا گیا ——— چائے پی پی کر انہوں نے سر میں درد کر لیا۔

میں پھر کھجانے لگی، ان کی پیٹھ ——— چکنی میز کی تختی جیسی پیٹھ ——— میں ہولے ہولے کھجاتی رہی۔ ان کا کام کر کے کیسی خوشی ہوتی تھی۔

"ذرا زور سے کھجاؤ ــــ بند کھول دو ــــ" بیگم جان بولیں " ادھر ــــ اے ہے ذرا شانے سے نیچے ــــ ہاں ــــ واہ بھئی واہ ــــ ہا ــــ ہا ــــ" وہ سرور میں ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لے کر اطمینان ظاہر کرنے لگیں۔

" اور ادھر ــــ" حالانکہ بیگم جان کا ہاتھ خوب جا سکتا تھا۔ مگر وہ مجھ سے ہی کھجوا رہی تھیں اور مجھے الٹا فخر ہو رہا تھا۔" یہاں ــــ اوئی ــــ تم تو گدگدی کرتی ہو ــــ واہ ــــ" وہ ہنسیں۔ میں باتیں بھی کر رہی تھی، اور کھجا بھی رہی تھی۔

تمہیں کل بازار بھیجوں گی۔ ــــ کیا لوگی ــــ وہی سوتی جاگتی گڑیا۔

نہیں بیگم جان ــــ میں تو گڑیا نہیں لیتی ــــ کیا بچہ ہوں اب میں ــــ"

بچہ نہیں تو کیا بوڑھی ہو گئی ــــ وہ ہنسیں ــــ گڑیا نہیں تو بنوا لینا ــــ کپڑے پہنانا خود۔ میں دوں گی تمہیں بہت سے کپڑے سُنا ــــ" انہوں نے کروٹ لی۔

" اچھا۔" میں نے جواب دیا۔

" ادھر ــــ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر جہاں کھجلی ہو رہی تھی، رکھ دیا۔ جہاں انہیں کھجلی معلوم ہوتی، وہاں میرا ہاتھ رکھ دیتیں۔ اور میں بے خیالی میں بوے کے دھیان میں ڈوبی مشین کی طرح کھجاتی رہی، اور وہ متواتر باتیں کرتی رہیں۔

" سُنو تو ــــ تمہاری فراکیں کم ہو گئی ہیں۔ کل درزی کو دے دوں گی، کہ نئی سی لائے۔ تمہاری اماں کپڑا دے گئی ہیں۔"

وہ لال کپڑے کی نہیں بنواؤں گی ــــ چماروں جیسی ہے ــــ میں بکواس کر رہی تھی، اور ہاتھ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔ بیگم جان تو چت لیٹی تھیں ــــ ارے ــــ میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

" اوئی لڑکی ــــ دیکھ کر نہیں کھجاتی ــــ میری پسلیاں نوچے ڈالتی ہے ــــ" بیگم جان شرارت سے مسکرائیں، اور میں جھینپ گئی۔

"ادھر آکر میرے پاس لیٹ جا ۔۔۔۔" انہوں نے مجھے بازو سے سر رکھ کر لٹا لیا۔

"اسے ہے کتنی سوکھ رہی ہے ۔۔۔۔ پسلیاں نکل رہی ہیں۔" انہوں نے میری پسلیاں گننا شروع کیں۔

"اوں ۔۔۔۔ میں منمنائی۔

"اوئی ۔۔۔۔ تو کیا میں کھا جاؤں گی ۔۔۔۔ کیسا تنگ سویٹر بنا ہے!"

گرم بنیان بھی نہیں پہنا تم نے ۔۔۔۔" میں کلبلانے لگی۔

"کتنی پسلیاں ہوتی ہیں ۔۔۔۔" انہوں نے بات بدلی۔

"ایک طرف نو اور ایک طرف دس۔" میں نے اسکول میں یاد کی ہوئی ہائی جین کی مدد لی۔

وہ بھی اوٹ پٹانگ

"ہٹاؤ تو ہاتھ ۔۔۔۔ ہاں ایک ۔۔۔۔ دو ۔۔۔۔ تین ۔۔۔۔"

میرا دل چاہا کس طرح بھاگوں ۔۔۔۔ اور انہوں نے زور سے بھینچا۔

"اوں ۔۔۔۔" میں مچل گئی ۔۔۔۔ بیگم جان زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اب بھی جب کبھی میں ان کا اس وقت کا چہرہ یاد کرتی ہوں، تو دل گھبرانے لگتا ہے ۔۔۔۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے اور وزنی ہو گئے۔ اوپر کے ہونٹ پر سیاہی گھری ہوئی تھی۔ باوجود سردی کے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ہونٹوں اور ناک پر چمک رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ ٹھنڈے یخ تھے۔ مگر نرم جیسے ان پر کی کھال اتر گئی ہو۔ انہوں نے شال اتار دی تھی، اور کارگے کے مہین کرتے میں ان کا جسم آٹے کی لونی کی طرح چمک رہا تھا۔ بھاری جڑاؤ سونے کے بٹن گریبان کے ایک طرف جھول رہے تھے۔ شام ہو گئی تھی، اور کمرے میں اندھیرا گھٹ رہا تھا۔ مجھے ایک نامعلوم ڈر سے وحشت سی ہونے لگی۔ بیگم جان کی گہری گہری آنکھیں۔ میں رونے لگی دل میں۔ وہ مجھے ایک مٹی کے کھلونے کی طرح بھینچ رہی تھیں۔ ان کے گرم گرم جسم سے میرا دل ہولانے لگا۔ مگر ان پر تو جیسے کوئی بھتنا سوار تھا۔ اور میرے دماغ کا یہ حال کہ نہ چیخا جائے، اور نہ رو سکوں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پست ہو کر نڈھال لیٹ گئیں۔ ان کا چہرہ پھیکا اور بد رونق ہو گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔ میں سمجھی کہ اب مریں یہ۔ اور وہاں سے اٹھ کر سرپٹ بھاگی باہر۔!

شکر ہے کہ ربو رات کو آ گئی، اور میں ڈری ہوئی جلدی سے لحاف اوڑھ سو گئی۔ مگر نیند کہاں چپ گھنٹوں پڑی رہی۔

اماں کسی طرح آ ہی نہیں چکی تھیں۔ بیگم جان سے مجھے ایسا ڈر لگتا تھا کہ میں سارا دن ملاماؤں کے پاس بیٹھی رہی۔ مگر ان کے کمرے میں قدم رکھتے دم نکلتا تھا۔ اور کہتی کس سے اور کہتی ہی کیا کہ بیگم جان سے ڈر لگتا ہے؟ تو یہ بیگم جان جو میرے اوپر جان چھڑکتی تھیں۔

آج ربو میں اور بیگم جان میں پھر اَن بَن ہو گئی ـــــ میری قسمت کی خرابی کہئے، یا کچھ اور مجھے ان دونوں کی ان بن سے ڈر لگا۔ کیونکہ فوراً ہی بیگم جان کو خیال آیا کہ میں باہر سردی میں گھوم رہی ہوں، اور مروں گی نمونیہ میں۔

"لڑکی کیا میرا سر منڈوائے گی۔ جو کچھ ہو ہوا گیا، تو اور آفت آئے گی۔" انہوں نے مجھے پاس بٹھا لیا۔ وہ خود منہ ہاتھ سلفچی میں دھو رہی تھیں، چائے تپائی پر رکھی تھی۔

"چائے تو بناؤ ـــــ ایک پیالی مجھے بھی دینا ـــــ وہ تولیہ سے منہ خشک کر کے بولیں ذرا کپڑے بدل لوں۔"

وہ کپڑے بدلتی رہیں، اور میں چائے پیتی رہی۔ بیگم جان نائن سے پیٹھ ملواتے وقت اگر مجھے کسی کام سے بلواتیں، تو میں گردن موڑے موڑے جاتی۔ اور واپس بھاگ آتی۔ اب جو انہوں نے کپڑے بدلے، تو میرا دل الٹنے لگا۔ منہ موڑے میں چائے پیتی رہی۔

"ہائے اماں ـــــ میرے دل نے بے کسی سے پکارا ـــــ آخر ایسا میں بھائیوں سے کیا لڑتی ہوں، جو تم میری مصیبت ـــــ اماں کو ہمیشہ سے میرا لڑکوں کے ساتھ کھیلنا ناپسند ہے، کہو بھلا لڑکے کیا شیر چیتے ہیں۔ جو نگل جائیں گے ان کی لاڈلی کو۔ اور لڑکے بھی

کو کیا کچھ نہ دے گئے جس میں سے کچھ کباڑ خانوں کی نظر ہوا کچھ ہسپتالوں اور یتیم خانوں میں پہنچ گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو مس راج اور اس کے گروپ والی لڑکیوں کی جنگ شروع ہوئی اور انہیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ وہ کتنی بدصورت اور بے مصرف ہیں۔ دورانِ جنگ میں انہوں نے جو کچھ ہنر سیکھے وہ امن کے زمانے میں کام نہیں دے سکتے۔

زندگی کے اس اندھا دھند چکر نے آج اسے تکلی پکڑا دی ہے ماموں جان ایک صابر، ماہر نفسیات ہیں پھر بھی کئی بار جھنجلا کر مس راج کی تحلیل نفسی کر چکے ہیں۔ وہ مختلف مغربی ماہرین نفسیات کے اقوال زریں کے ذریعے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ مس راج کے تحت الشعور میں کوئی چبھن ہے جو نار کو بار بار کٹکی لگا دیتی ہے۔

ممانی بھی خوب جانتی ہیں کہ یہ تحت الشعور کی چبھن کیا بلا ہے۔ مگر ان کی تحلیل نفسی نہایت پھوڑپنے کی بدظنی ہے جس کا اظہار کرنے کی طاقت وہ عرصہ ہوا کھو چکی ہیں۔ اگلے دنوں کے لوگ کھلے بندوں رنڈی کے کوٹھے پر چڑھتے تھے، آج ان کے سپوت شعور اور لاشعور کی چلمن ڈال کر وہی کچھ کر لیتے ہیں۔ مگر وہ اتنا جانتی ہیں کہ مس راج بھی ان سے کم مجبور نہیں۔ جینے کا خیال چھوڑ کر ساری عمر مس راج اسی طرح ادھیڑ عمر کے ماہرین نفسیات کی ذہنی ٹھوکروں میں رلتی رہے گی۔ ان کے لاشعور ہاتھوں کا کھلونا بنی رہے گی۔ ہر قہقہے پر نار ٹوٹتا ہے تو جھلا کر چونک پڑتی ہیں۔ ان کا انتخابی نسل خون کھول اٹھتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے تکلی بھینچنے لگتی

سر سر پھٹ کے ـــــ بیگم جان کا لحاف اندھیرے میں پھر ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا
"اللہ! آں ـــــ" میں نے مری ہوئی آواز نکالی۔ لحاف میں ہاتھی پھدکا، اور بیٹھ گیا۔ میں بھی چپ ہو گئی۔ ہاتھی نے پھر لوٹ مچائی۔ میرا رونداں رونداں کانپا۔ آج میں نے دل میں ٹھان لیا کہ ضرور ہمت کر کے سرہانے کا لگا ہوا بلب جلا دوں۔ ہاتھی پھر پھڑ پھڑا رہا تھا، اور جیسے اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چپڑ چپڑ کچھ کھانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی مزے دار چٹنی چکھ رہا ہو۔ اب میں سمجھی! یہ بیگم جان نے آج کچھ نہیں کھایا۔ اور رَبّو مردی تو ہے سدا کی چٹو۔ ضرور یہ تر مال اڑا رہی ہے۔ میں نے نتھنے پھلا کر سوں سوں ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر صندل اور حنا کی گرم گرم خوشبو کے اور کچھ نہ محسوس ہوا۔

لحاف پھر اُمنڈنا شروع ہوا۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ چپکی پڑی رہوں۔ مگر اس لحاف نے تو ایسی عجیب عجیب شکلیں بنانی شروع کیں کہ میں لرز گئی۔ معلوم ہوتا تھا غوں غوں کر کے کوئی بڑا سا مینڈک پھول رہا ہے۔ اور اب اچھل کر میرے اوپر آیا۔

آ ـــ ن ـــ اماں ـــــ میں ہمت کر کے گنگنائی۔ مگر وہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی، اور لحاف میرے دماغ میں گھس کر پھولنا شروع ہوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پلنگ کے دوسری طرف پیر اُتارے، اور ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبایا۔ ہاتھی نے لحاف کے نیچے ایک قلابازی لگائی، اور پچک گیا۔ قلابازی لگانے میں لحاف کا کونا فٹ بھر اٹھا۔

اللہ! میں غڑاپ سے اپنے بچھونے میں آیا۔

عصمت چغتائی کی آپ بیتی

کاغذی ہے پیرہن

قارئین کے لئے ایک نادر تحفہ

عمدہ کاغذ

بہترین پرنٹنگ

چودھری اکیڈمی۔ لاہور

کرشن چندر کے
بہترین افسانے
مرتبین
محمد خالد چوہدری ، پروفیسر اختر جعفری
سفید کاغذ ، عمدہ کتابت
قیمت: ۱۸ روپے
چوہدری اکیڈمی لاہور

کتاب	مصنف	قیمت
خواجہ معین الدین چشتی	منشی عبدالحمید بہاری	۱۲ــــ۰۰ روپے
موت کی یاد	مولانا محمد ذکریا	۵ــــ۰۰ 〃
رسول اللہ کی پیشین گوئیاں اور علاماتِ قیامت	مولانا محمد عاشق	۸ــــ۰۰ 〃
رسول اللہ کی دعائیں	مولانا نور محمد	۸ــــ۰۰ 〃
بہروپیا	کرشن چندر	۱۵ــــ۰۰ 〃
کتاب کا کفن	کرشن چندر	۱۳ــــ۰۰ 〃
دوسری برفباری سے پہلے	کرشن چندر	۱۵ــــ۰۰ 〃
ایک گرجا ایک خندق	کرشن چندر	۱۲ــــ۰۰ 〃
اَن داتا	کرشن چندر	۱۰ــــ۰۰ 〃
فٹ پاتھ کے فرشتے	کرشن چندر	۱۰ــــ۰۰ 〃
ایک عورت ہزار دیوانے	کرشن چندر	۲۰ــــ۰۰ 〃
کرشن چندر کے بہترین افسانے	کرشن چندر	۱۸ــــ۰۰ 〃
روٹی، کپڑا اور مکان	کرشن چندر	۱۵ــــ۰۰ 〃
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	۴۵ــــ۰۰ 〃
ایک بات	عصمت چغتائی	۱۵ــــ۰۰ 〃
عصمت چغتائی کے بہترین افسانے	عصمت چغتائی	۲۰ــــ۰۰ 〃
کاغذی ہے پیراہن	عصمت چغتائی	۲۵ــــ۰۰ 〃
جنگل	مرزا ادیب	۱۸ــــ۰۰ 〃
سودائی	عصمت چغتائی	۱۰ــــ۰۰ 〃
ایک تھی انیتا	امرتا پریتم	۱۲ــــ۵۰ 〃
ایک سوال	امرتا پریتم	۹ــــ۰۰ 〃
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	راجندر سنگھ بیدی	۱۲ــــ۰۰ 〃
لمبی لڑکی	راجندر سنگھ بیدی	۹ــــ۰۰ 〃
ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	۹ــــ۰۰ 〃
غالب کی شخصیت اور شاعری	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۱۰ــــ۰۰ 〃
آپ کی شخصیت	میاں محمد رفیق	۱۰ــــ۰۰
گئودان	منشی پریم چند	۲۵ــــ۰۰
یادوں کی بارات	جوش ملیح آبادی	۸۰ــــ۰۰ روپے
قہقہہ زار	عبدالغفور	۱۵ــــ۰۰ 〃
آخرِ شب کے ہمسفر	قرۃ العین حیدر	۴۰ــــ۰۰ 〃
ہاؤسنگ سوسائٹی	قرۃ العین حیدر	۱۳ــــ۰۰ 〃
روشنی کے مینار	قرۃ العین حیدر	۲۵ــــ۰۰ 〃
قرۃ العین حیدر کے بہترین افسانے	قرۃ العین حیدر	۳۰ــــ۰۰ 〃
نازک خیالیاں	کنہیا لال کپور	۱۲ــــ۰۰ 〃
تین پیسے کی چھوکری	قاضی عبدالغفار	۹ــــ۰۰ 〃
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	۹ــــ۰۰ 〃
پاگل یوحنا	خلیل جبران	۹ــــ۰۰ 〃
اسرارِ حیات	خلیل جبران	۹ــــ۰۰ 〃
تین عورتیں	سعادت حسن منٹو	۱۰ــــ۰۰ 〃
دہانِ زخم	عبدالحمید عدم	۲۰ــــ۰۰ 〃
خرابات	عبدالحمید عدم	۲۵ــــ۰۰ 〃
چاک پیراہن	عبدالحمید عدم	۱۸ــــ۰۰ 〃
چارۂ درد	عبدالحمید عدم	۱۵ــــ۰۰ 〃
رنگینیاں	شکیل بدایونی	۲۵ــــ۰۰ 〃
آؤ کہ کوئی خواب بُنیں	ساحر لدھیانوی	۷ــــ۰۰ 〃
متاعِ غیر	ساحر لدھیانوی	۹ــــ۰۰ 〃
ساحر اور اس کی شاعری	پنڈت پرکاش	۹ــــ۰۰ 〃
شراب اور شباب	میاں محمد رفیق	۱۵ــــ۰۰ 〃
بازارِ حسن	منشی پریم چند	۳۵ــــ۰۰ 〃
بیوہ	منشی پریم چند	۱۳ــــ۰۰ 〃
شعلۂ حسن	منشی پریم چند	۱۲ــــ۰۰ 〃
میرے بہترین افسانے	منشی پریم چند	۱۳ــــ۰۰ 〃
نرملا	منشی پریم چند	۱۵ــــ۰۰ 〃
آئینۂ قسمت	آغا اشرف	۲۹ــــ۰۰
دست شناسی کا انسائیکلوپیڈیا	آغا اشرف	۲۰ــــ۰۰

چودھری اکیڈمی ○ ۳۰۵ ذوالقرنین چیمبرز ○ گنپت روڈ ○ لاہ

عصمت چغتائی کا پہلا ناول
ٹیڑھی لکیر
سفید کاغذ
آفسٹ کتابت
قیمت ۴۵ روپے
چوہدری اکیڈمی، لاہور